لہو کے تاجر

علیم الحق حقی

اس نے ریوالور کو روشنی کے سامنے کیا اور آہستہ آہستہ اسے گھما کر دیکھا مگر اس پر کہیں گرد کا کوئی ذرہ بھی نہیں تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے سائلنسر کو ریوالور کی نال پر فٹ کیا پھر اسے کپڑے کی اس صافی میں لپیٹ دیا جس سے اس نے تیل دینے کے بعد ریوالور کی صفائی کی تھی۔

چند لمحوں کے لئے شہناز کا خوف معدوم ہو گیا۔ وہ بڑی دلچسپی سے بابر کو ریوالور کی صفائی کرتے دیکھ رہی تھی۔ بابر کی انگلیوں میں اسے رقص کا سا ردھم محسوس ہوا تھا۔ اس نے ریوالور کے پرزے الگ کر کے انہیں سفید کپڑے پر رکھا اور پھر ان کی صفائی کی تھی۔ اس کے بعد وہ پرزے دوبارہ ریوالور کا روپ اختیار کر گئے تھے اور اسی لمحے شہناز کا خوف پھر لوٹ آیا تھا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ یہ اہتمام کس لئے ہو رہا ہے۔ اسے یعنی شہناز کو ایک شخص کو قتل کرنا تھا اور اس وقت کا تعین ایک ہفتے پہلے کر لیا گیا تھا۔ وہ بڑی توجہ سے سنتی اور تفصیلات ذہن نشین کرتی رہی تھی مگر اس وقت اور بات تھی۔ اب تو وہ دن.......... وہ وقت آ پہنچا تھا۔ اب یہ حقیقت تھی کہ اسے ایک شخص کو قتل کرنا تھا.......... بابر کے خواب کی تعبیر کے لئے.......... اس کے منصوبے کی تکمیل کے لئے۔

یہ سوچتے ہی خوف نے اس کے جسم کو شل کر دیا۔ اگر وہ بابر کی خواہش کے مطابق عمل نہ کر سکی.......... یا عمل کیا مگر بابر کی توقعات پر پورا نہ اتر سکی تو.......... تو کیا ہو گا؟ اس نے جواب دیئے بغیر اس سوال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

"چلو بھئی.......... اب تیار ہو جاؤ۔" بابر کہہ رہا تھا۔

شہناز جانتی تھی کہ وہ تباہی اور بربادی کے اس راستے پر قدم رکھ رہی ہے جہاں

سے واپسی ناممکن ہے مگر فوراً ہی اس نے سوچا کہ تباہ و برباد تو وہ پہلے ہی ہو چکی ہے۔ سب کچھ چھن چکا ہے اور پچھلی بربادی کے بعد ہی واپسی کا راستہ کب اس کے لئے کھلا تھا؟ حالانکہ اس بار تو اسے اس کا علم بھی نہیں تھا کہ واپسی ممکن نہیں ہے۔ وہ تو کھیل ہی کھیل میں برباد ہوئی تھی۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ یہ کب کی بات ہے.........

چار سال.........پانچ سال پہلے کی۔ ہاں.........کوئی پانچ سال پہلے کی ہی تو بات تھی۔

یادوں کے دریچے کھلنے لگے.........

☆============☆============☆

انسان کو تباہ کرنے والے دن کوئی انوکھے تھوڑے ہی ہوا کرتے ہیں۔ عام طور پر وہ عام سے دن ہوتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو وہ تباہ ہونے والے کو بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ تو بعد میں ان کی نحوست کا پتا چلتا ہے۔ شہناز کے لئے وہ دن بہت چپکے سے' بہت خوبصورتی کے ساتھ آیا تھا۔ اس روز سائرہ پہلی بار کلاس میں آئی تھی۔

شہناز کا تعلق کراچی کے ایک معزز مگر متوسط گھرانے سے تھا۔ اس کے والد ایک سرکاری محکمے میں گریڈ ۱۴ کے افسر تھے۔ والدہ خالص گھریلو عورت تھیں۔ وہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ سب سے بڑا بھائی والد کے محکمے میں ہی کلرک تھا۔ باقی دو بھائی ابھی پڑھ رہے تھے۔ ان میں ایک اس سے چھوٹا تھا۔ وہ خالص سفید پوش گھرانا تھا جسے مہنگائی کے اس دور میں سفید پوشی کا بھرم رکھنا پڑتا تھا اور یہ بڑا مشکل کام تھا۔

شہناز نے میٹرک کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لیا تو اسے لگا کہ وہ اچانک بڑی ہوگئی ہے۔ وہ خوبصورت اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ تین چار دن میں ہی کلاس کی لڑکیوں سے گھل مل گئی بلکہ تین لڑکیوں سے تو اس کی گہری دوستی ہوگئی۔ ان کے آخری پیریڈ ہوتے تو بھی وہ گھر نہ جاتیں بلکہ کامن روم میں بیٹھی باتیں کرتی رہتیں۔ کالج بند ہونے کے وقت ہی وہ گھر جانے کے لئے نکلتیں۔

کلاسیں شروع ہوئے ایک مہینہ ہوا تھا کہ سائرہ نے اسی کالج میں داخلہ لیا۔ وہ اتنے دن کسی اور کالج میں داخلے کے لئے کوشش کرتی رہی تھی۔ وہاں ناکامی کے بعد اس نے مجبوراً اس کالج میں داخلہ لیا تھا۔ سائرہ ہر اعتبار سے دوسری لڑکیوں سے مختلف تھی۔

پہلے پیریڈ میں ہی مس نسیم نے اسے لیکچر پلا دیا۔ "بی بی......... یہ کالج ہے۔ یہاں تم تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتی ہو۔" انہوں نے درشتی سے کہا۔ "یہاں کوئی فیشن شو نہیں ہو رہا یہاں تمہیں طالبہ بن کر آنا پڑے گا۔ یہاں تو ناخن پالش تک نہیں چلے گی۔"

شہناز کو سائرہ پہلی ہی نظر میں بھا گئی۔ وہ اسے دیکھ کر یہ سوچتی رہی کہ یہ لڑکی آخر کس ہیروئن سے ملتی ہے۔ اس کے ترشے ہوئے بال' چہرے پر ہلکا سا میک اپ......... وہ واقعی بہت حسین لگ رہی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کا انداز بڑا پیارا تھا......... عام لڑکیوں سے مختلف۔ اس کے انداز میں بڑی خود اعتمادی تھی۔ شہناز یہ تو طے نہیں کر سکی کہ سائرہ کس ہیروئن سے ملتی ہے لیکن اس نے اسی روز کامن روم میں سائرہ سے دوستی کرلی۔ اب ان کے گروپ کی عددی طاقت پانچ ہوگئی۔ وہ چاروں' سائرہ سے بہت مرعوب ہوگئیں۔ وہ واقعی ہر اعتبار سے ان سے مختلف تھی۔ اسے مختلف اسٹائل کے بال بنانا آتے تھے۔ میک اپ کرنا وہ جانتی تھی۔ آزاد خیال وہ بہت تھی۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ والد کا الیکٹرونکس کا بڑا کاروبار تھا۔ کالج کے قریب ہی ایک فیشن ایبل بستی میں ان کا بنگلا تھا۔ دن بھر گھر میں ایک ملازمہ کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا۔

اب خالی پیریڈز میں کامن روم میں فیشن کی کلاسیں ہونے لگیں۔ شہناز' نائلہ' انجم اور راشدہ کے بال چھوٹے ہوتے گئے۔

"مجھے بھی یہ سب کچھ سکھا دو نا۔" ایک دن نائلہ نے سائرہ سے کہا۔ "میں بھی تم جیسی بننا چاہتی ہوں۔" وہ شہناز کے دل کی بھی آواز تھی۔

"میں تو نہیں بنا سکتی۔ انڈین فلمیں غور سے دیکھو تو خود ہی بن جاؤ گی۔" سائرہ نے بے پروائی سے کہا۔

"انڈین فلمیں؟" شہناز نے حیرت سے کہا۔

"ہاں بھئی انڈین فلمیں۔ وی سی آر پر۔"

"وی سی آر تو ہم میں سے کسی کے ہاں بھی نہیں ہے۔" رشیدہ نے سب کی نمائندگی کی۔

"میرے گھر میں تو ہے۔ رنگین ٹی وی بھی ہے......... چھبیس انچ والا۔" سائرہ

نے فخریہ لہجے میں کہا۔ پھر فراخدلانہ پیشکش کی۔ "تم لوگ میرے گھر چل کر فلمیں دیکھ سکتی ہو۔"

"واقعی؟" انجم نے خوش ہو کر کہا۔ "لیکن کب؟"

"جب تم لوگوں کا جی چاہے۔ میرے ڈیڈی تو رات کو نو بجے سے پہلے واپس نہیں آتے۔ آ بھی جائیں تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ آج ہی چلو۔"

یہ گفتگو کامن روم میں آخری پیریڈ کے دوران ہو رہی تھی۔ شہناز نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ "لیکن گھر جانے میں دیر ہو جائے گی۔"

"چھوڑو یار۔ کیا بیک ورڈ باتیں کرتی ہو۔" سائرہ نے ملامت کرتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے، گھر کے لوگوں کو تمہارے انتظار کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔"

"ایسی ہی بات ہے۔" شہناز نے شرمندگی سے کہا۔ دوسری سہیلیوں نے بھی اس کی تائید کی۔ "واقعی سائرہ، یہ تو ممکن نہیں۔"

"تو پھر چھوڑو۔ میری تو غرض ہے نہیں۔" سائرہ نے نخوت سے کہا۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

لیکن انڈین فلموں کی ترغیب ایسی نہیں تھی جس سے وہ چاروں بچ سکتیں۔ ان کے درمیان سنگین اور کشیدہ خاموشی حائل تھی۔ چاروں اپنے اپنے طور پر اس مسئلے کا حل سوچ رہی تھیں اور پانچویں بیزار بیٹھی تھی۔ پھر اچانک انجم نے کہا۔ "ایسا کرتے ہیں، کل کالج کے بجائے تمہارے گھر چلتے ہیں۔ وہاں فلم دیکھ لیں گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے تو ویسے بھی اس کالج سے کوئی دلچسپی نہیں۔" سائرہ نے کہا۔ "یہاں تو لیکچرار کی پوسٹ پر ملانیوں کو بھرتی کر لیا گیا ہے۔"

شہناز اختلاف کرنا چاہتی تھی لیکن اسے ڈر تھا کہ سائرہ کا موڈ پھر خراب ہو جائے گا۔ پھر اس نے سوچا، ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ چنانچہ اس نے کہا۔ "ہاں۔ یہ ٹھیک رہے گا۔"

اگلے روز وہ پانچوں کالج کے قریب والے بس اسٹاپ پر پروگرام کے مطابق یکجا ہوئیں۔ وہاں سے وہ کالج کی بجائے سائرہ کے گھر کی طرف چل دیں۔ راستے میں ایک

ویڈیو شاپ نظر آئی۔ سائرہ نے کہا۔ "بھئی یہاں سے فلم لے چلو۔ شہناز، ایسا کرو، تم جا کر فلم لے آؤ۔ ہم یہیں کھڑے ہیں۔" اس نے ایک فلم کا نام بتا دیا۔

شہناز کا دل ہولنے لگا۔ وہ انکار کرنا چاہتی تھی مگر سارہ کے لہجے میں قطعیت تھی۔ پھر بیک ورڈ ہونے کا طعنہ اسے بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ وہ لرزتے قدموں سے دکان کی طرف بڑھ گئی۔ ایک تو کالج یونیفارم میں ہونے کی وجہ سے اسے ویسے ہی چوری کا احساس ہو رہا تھا اور پھر ویڈیو شاپ میں جانا اور فلم لینا لیکن اسے اپنے فارورڈ ہونے کا ثبوت فراہم کرنا تھا۔

دکان میں ایک جوان آدمی تھا۔ اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان ہوگی۔ اس نے بڑی خوش اخلاقی سے نرم لہجے میں پوچھا۔ "جی فرمایئے؟"

شہناز کو احساس تھا کہ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں بلکہ اسے تو لگتا تھا کہ کسی بھی لمحے اس کی ٹانگیں جواب دے جائیں گی اور وہ ڈھیر ہو جائے گی۔ اس نے بڑی ہمت کر کے فلم کا نام دہرایا مگر اس کی آواز بری طرح لرز رہی تھی۔ اسے توقع تھی کہ دکان دار اسے جھڑک کر بھگا دے گا.......... مگر دکان دار نے ریک پر نظر ڈالی اور ایک کیسٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ پھر اس نے بے حد نرم لہجے میں پوچھا۔ "آپ کا نام اور پتا؟" دکاندار کے لہجے نے شہناز کو سہارا دیا۔ اس نے سائرہ کا نام اور پتا لکھوا دیا۔ دکان دار نے رجسٹر میں اندراج کیا اور کہا۔ "جی.......... لے جایئے۔ کرایہ پانچ روپے ہوگا۔"

شہناز کو حیرت ہوئی۔ دکان دار نے بغیر کسی تصدیق کے اسے اپنی قیمتی کیسٹ دے دی تھی۔ بہرحال یہ سب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ تیزی سے دکان سے نکلی۔ دکان سے نکلتے ہی اس کے قدموں میں مضبوطی اور ٹھہراؤ آگیا۔ سہیلیوں تک پہنچتے پہنچتے اس کے انداز میں خود اعتمادی آگئی۔ انجم، رشیدہ اور نائلہ اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ یہ اس کے لئے بڑی بات تھی۔

گھر پہنچ کر سائرہ نے فلم لگا دی۔ ان لوگوں نے فلم دیکھی انہیں وہ بالکل نئی دنیا لگی۔ بہت بڑا کمرا.......... بڑا ٹی وی۔ سب کچھ جیتا جاگتا لگ رہا تھا۔ فلم میں چند مناظر

ایسے تھے جن پر انہیں شرم آئی مگر سائرہ کے "بیک ورڈ" والے طعنے نے انہیں خاموش کردیا۔

اگلی بار سائرہ ان کے ساتھ نہیں تھی۔ شہناز کو اس نے فلم کا نام بتا دیا تھا۔ شہناز دکان میں نسبتاً زیادہ اعتماد کے ساتھ گئی۔ اس بار دکان دار نے اس کا نام پتا بھی نہیں پوچھا۔ ہربار واپسی میں وہ کیسٹ واپس کردیتی تھی۔

پہلے ہفتے میں انہوں نے دو دن کالج سے چھٹی کر کے فلمیں دیکھیں مگر پھر آہستہ آہستہ کالج کی چھٹیاں بڑھتی گئیں۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ ہفتے میں ایک بار بھی کالج نہیں گئیں۔ کبھی ان میں سے کوئی اس بات پر تشویش ظاہر کرتی تو دوسری لڑکی دلاسا دے دیتی کہ ابھی پڑھائی کہاں شروع ہوئی ہے۔ آخری چھ ماہ میں محنت کرلیں گے۔

ایک دن شہناز کیسٹ لینے گئی تو دکان دار نے نرم لہجے میں کہا۔ "اپنا شناختی کارڈ دکھایئے۔"

وہ خوش مزاج آدمی ثابت ہوا تھا۔ اب وہ قدرے بے تکلفی سے اس سے ادھر ادھر کی باتیں بھی کرلیتا تھا۔ شہناز نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

دکان دار نے کارڈ کا جائزہ لیا اور بولا "آپ رجسٹر میں اپنا نام کیوں نہیں لکھواتیں؟"

"دراصل ہم سائرہ کے گھر میں ہی فلمیں دیکھتی ہیں۔" شہناز نے وضاحت کی۔

"مجھ سے تو کیسٹ آپ لے کر جاتی ہیں۔ میں نام آپ کا ہی لکھوں گا۔" دکاندار نے کہا۔ پھر شہناز کو پریشان دیکھ کر دلاسا دیا۔ "آپ جانتی ہیں کہ یہ محض رسمی کارروائی ہے۔"

شہناز مطمئن ہوگئی۔ واقعی اس میں حرج بھی کوئی نہیں تھا۔

انہیں احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ فلموں میں آہستہ آہستہ عریانیت بڑھتی جارہی ہے۔ بلکہ وہ اس کی عادی ہوگئی تھیں۔ ان کے نزدیک اب یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں رہی تھی۔

پھر ایک دن اچانک ایک فلم دیکھتے ہوئے جیسے جادو ہوگیا۔ فلم کا منظر قطع ہوا اور

اسکرین پر جو کچھ نظر آیا اس نے شہناز کو دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھنے پر مجبور کردیا۔ نائلہ اور انجم کا بھی یہی ردعمل تھا۔ رشیدہ نے البتہ منہ دوسری طرف پھیرنے پر اکتفا کیا تھا۔ ان سب کے چہرے سرخ ہوگئے تھے۔

ایسے میں سائرہ کی آواز ابھری۔ "میں دعوے سے کہتی ہوں کہ ہم سب اس لڑکی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہیں.......... میرا مطلب ہے' اندر سے۔ اور شہناز کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔"

اسی جملے کے نتیجے میں آنکھوں پر رکھے ہوئے ہاتھ ہٹ گئے۔ چند لمحے وہ جیسے موازنہ کرتی رہیں پھر انہوں نے دوبارہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

"سچ یار.......... تم لوگ بڑی بیک ورڈ ہو۔" سائرہ نے تنک کر کہا۔

"یہ.......... یہ تو بے شرمی ہے سائرہ۔" شہناز نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"لیکن یہاں کون ہے سوائے ہم لوگوں کے۔ کوئی مرد یہاں موجود ہوتا تو بے شرمی ہوتی۔" سائرہ نے دلیل دی۔ "اور پھر اس میں بھی کیا حرج ہے۔ آج کل کی سوسائٹی میں.........."

"لیکن زلیخا بھی آسکتی ہے.......... اور احمر بھی.........." شہناز نے اعتراض کیا۔

زلیخا ملازمہ کا نام تھا اور احمر سائرہ کے چھوٹے بھائی کا۔

"چلو.......... میں دروازہ بند کردیتی ہوں۔" سائرہ یہ کہہ کر اٹھی اور جاکر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کردیا۔ اس کے بعد انہوں نے پوری فلم دیکھی۔ فلم ختم ہونے کے بعد سائرہ نے کہا۔ "سچ کہتی ہوں' تم سب اس فلم والی لڑکی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو بلکہ میں تو کہتی ہوں' تم لوگوں جیسی حسین کوئی لڑکی ایسی کسی بھی فلم میں نہیں ملے گی۔"

تعریف نے ان لوگوں کو عجیب سی نظروں سے ایک دوسرے کو اور پھر خود کو دیکھنے پر مجبور کردیا۔ اس روز کے بعد آئینے کے سامنے ان سب کا انداز اور ہی کچھ ہوگیا۔

اسی روز وہ کیسٹ واپس کرنے گئی تو اس سے نظریں نہیں اٹھائی جارہی تھیں۔ اس نے کیسٹ اور پانچ روپے کا نوٹ کاؤنٹر پر رکھا اور پلٹ کر چل دی۔ دکاندار نے اسے آواز دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ "فلم کیسی تھی؟" دکان دار نے مسکرا

پوچھا۔ اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"اچھی تھی۔" شہناز نے کہا اور تقریباً بھاگتی ہوئی دکان سے نکل گئی۔

اب بلیو فلمیں دیکھنا معمول بن گیا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ اب وہ یہ فلمیں شوق سے دیکھتی تھیں۔ دو ایک بار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے انہوں نے عام فلمیں دیکھیں مگر لطف ہی نہیں آیا۔ اس دوران وہ کئی معروف اداکاراؤں کی ایسی فلمیں دیکھ چکی تھیں۔ انہیں حیرت ہوئی تھی کہ اتنی بڑی اداکارائیں بھی..........! پھر ایک دن وہ فلم لینے گئی تو دکان دار کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ "عام فلم چاہئے تو لے جاؤ۔" اس نے بے حد رکھائی سے کہا۔ "خاص فلم نہیں دے سکتا۔" تھوڑے سے اصرار اور دکان دار کے انکار کے بعد وہ سائرہ کے گھر پہنچی جہاں تمام سہیلیاں منتظر تھیں۔ شہناز نے صورت حال بتائی تو ان سب کی مایوسی کی حد نہ رہی۔

"کوئی بات نہیں۔" سائرہ نے انہیں تسلی دی۔ "کل پھر کوشش کر لینا۔"

لیکن اگلے تین روز تک دکاندار ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ سب چڑچڑی ہو گئیں۔ اب انہیں پتا چل رہا تھا کہ وہ ان فلموں کے بغیر رہ ہی نہیں سکتیں۔ شہناز کی بھی یہی کیفیت تھی۔ زندگی ویران اور بے رنگ لگنے لگی تھی۔ پانچویں روز دکاندار کے سامنے گڑگڑانے لگی۔ "پلیز.......... کچھ کریں۔"

"میں کچھ نہیں کر سکتا۔ باس کا حکم یہ ہے کہ اب خاص فلمیں کسی کو نہ دی جائیں۔" دکاندار نے کہا۔ "میں تو ملازم ہوں۔"

"آپ مجھے باس سے ملوا دیں۔" شہناز نے عاجزی سے کہا۔

"دیکھو.......... پوچھتا ہوں باس سے۔" دکاندار نے کہا اور اندرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ شہناز کو وہ دروازہ پہلی بار نظر آیا تھا۔ درحقیقت وہ دیوار کا ہی ایک حصہ نظر آتا تھا۔ بظاہر اسے سرسری طور پر دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کوئی دروازہ ہے۔ دکان دار اسے دھکیل کر اندر چلا گیا۔ چند ہی لمحوں میں اس کی واپسی ہوئی۔ "چلی جاؤ۔ باس تم سے ملیں گے۔ اچھے موڈ میں ہیں۔" اس نے کہا۔ "لیکن ان سے بحث نہ کرنا۔ انہیں غصہ جلدی آجاتا ہے۔"

شہناز نے اندر قدم رکھا اور ٹھٹک گئی۔ دروازے سے ایک قدم آگے کھڑے ہو کر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کمرے کا ماحول ایسا تھا کہ وہ مرعوب ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کیا کرے۔ اب اسے شرم بھی آرہی تھی۔ دکاندار کی بات اور تھی۔ کیا اب اس اجنبی شخص سے وہ ایسی کیسٹ کی فرمائش کرے گی۔ اسی لمحے میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے مرد کی آواز نے مسئلہ حل کر دیا۔

"آؤ.......... یہاں چلی آؤ۔" اس نے پکارا اور شہناز جیسے اس پکار پر جادو کی ڈور سے بندھی آگے بڑھنے لگی۔ قریب پہنچ کر اس نے دیکھا وہ ایک خوبرو اور ادھیڑ عمر مرد تھا لیکن نہ جانے کیوں اس کی شخصیت اچھا تاثر نہیں چھوڑ رہی تھی۔

"آؤ.......... بیٹھ جاؤ۔" اس شخص نے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شہناز واپس جانا چاہتی تھی۔ اس کا بیٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن دکاندار نے اسے بتا دیا تھا کہ اس وقت باس اچھے موڈ میں ہے لیکن اسے غصہ جلدی آجاتا ہے چنانچہ وہ بیٹھ گئی۔

"مسئلہ یہ ہے شہناز بی بی کہ آج کل پولیس بڑی سختی کر رہی ہے۔" اس شخص نے کہا۔ شہناز کو اس کے منہ سے اپنا نام سن کر جھٹکا لگا مگر فوراً ہی پولیس کے تذکرے سے اس کا دم نکل گیا۔ "اس لئے میں نے اصغر کو کیسٹ دینے سے منع کر دیا ہے۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے پولیس نے ہمارا رجسٹر چیک کیا تھا۔ تمہارے نام پر وہ اٹک گئے تھے۔ تمہارا پتا پوچھ رہے تھے مگر ہم نے نہیں دیا۔"

شہناز کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ "مم.......... مم مم.......... میرا.......... پپ.......... پپ.......... پتا.........." وہ بری طرح ہکلائی۔

وہ مسکرایا۔ "ہاں.......... تمہارا پتا ہمارے پاس ہے لیکن رجسٹر میں صرف کالج کا نام لکھا تھا۔ وہ تمہارے کالج جانے کو کہہ رہے تھے.........."

"کا.......... کالج۔" شہناز کے ہاتھ پیر سن ہو گئے۔ پولیس اس کے گھر اور کالج بھی

پہنچ سکتی ہے۔ یہ تصور ہی اس کے لئے مر جانے کے مترادف تھا۔ اس کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔

"ہاں.......... لیکن تم فکر نہ کرو۔ میرے پولیس میں بڑے تعلقات ہیں۔" اس شخص نے اکڑ کر کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم کالج کم ہی جاتی ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم عزت دار گھر کی بیٹی ہو۔ میں انہیں نہ کالج پہنچنے دوں گا نہ تمہارے گھر۔ بلکہ میں تو کالج میں بھی تمہاری حاضریاں برابر کرادوں گا۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔"

شہناز کو اس وقت وہ شخص فرشتہ لگا.......... مہربان' مخلص' خیال رکھنے والا۔ اس وقت اس کی عزت اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے بے فکر رہنے کو کہہ رہا تھا۔

"مگر تم نے یہاں آکر غلطی کی ہے۔" وہ شخص بولا۔ "ایک منٹ.........." یہ کہہ کر وہ اٹھا اور دکان میں کھلنے والے دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ ذرا سا کھول کر اس نے دکان میں جھانکا اور فوراً ہی واپس چلا آیا۔ "میرا خدشہ درست تھا۔" اس نے کہا۔ "دکان میں دو پولیس والے تمہارے متعلق پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔"

شہناز کے اوسان خطا ہوگئے۔ "ا.......... اب.......... کک.......... کیا.......... ہوگا؟" وہ ہکلائی۔

"میں پھر کہوں گا کہ تم فکر نہ کرو۔" وہ مسکرایا۔ "آؤ میرے ساتھ۔ انہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ تم یہاں آئی ہو۔"

شہناز اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کمرے میں ویسا ہی ایک دروازہ اور بھی تھا جیسے دروازے سے گزر کر وہ اس کمرے میں آئی تھی۔ اس شخص نے وہ دروازہ کھولا اور شہناز کو ایک کمرے میں لے گیا۔ وہ نسبتاً چھوٹا کمرا تھا۔ شہناز نے ایسے کمرے صرف فلموں میں ہی دیکھے تھے۔ اس میں صرف ایک بہت بڑا بیڈ تھا.......... بہت خوبصورت بیڈ۔ بیڈ کے ساتھ ایک میز تھی۔

"یہاں بیٹھ جاؤ۔" اس شخص نے کہا۔

وہاں بیٹھنے کو بیڈ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ شہناز بیٹھ گئی۔ اس پر پولیس والوں کا ہول سوار تھا۔ اس شخص نے فریج کھول کر ایک بوتل نکالی اور گلاس میں مشروب انڈیلا پھر

اس میں پانی ملا کر وہ گلاس اس کے پاس لے آیا۔ "لو.......... یہ شربت پی لو۔"

شہناز کا خوف دو چند ہوگیا۔ "جی۔ شکریہ۔ میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔"

"پی لو ورنہ مجھے غصہ آجائے گا اور میں تمہیں اپنے کمرے سے نکال دوں گا۔ اس کمرے میں' میں کسی کو نہیں لاتا۔ وہ تو بس پولیس والوں سے بچانے کے لئے تمہیں یہاں لے آیا ہوں۔"

شہناز کو دکان دار کی بات یاد آگئی اس نے گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔ اسے پھندا لگ گیا۔ اس شخص نے جلدی سے بڑھ کر گلاس سنبھال لیا۔ "یہ تو بہت کڑوا ہے۔" شہناز نے فریاد کی۔

"ہاں۔ اس کی مٹھاس' کڑواہٹ پینے کے بعد کھلتی ہے۔"

اس وقت تک شہناز بہت فلمیں دیکھ چکی تھی۔ "یہ شراب ہے؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ اب جلدی سے اسے ایک گھونٹ میں پی جاؤ۔" اس نے گلاس شہناز کو تھمادیا۔ "تم سمجھ دار ہو۔ سمجھ دار لڑکیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

باہر پولیس تھی' رسوائی تھی اور موت تھی اور اندر ایک ایسا مہربان شخص تھا جو اسے پولیس' رسوائی اور موت سے بچانے پر آمادہ تھا لیکن اسے غصہ جلدی آجاتا تھا۔ چنانچہ اس نے دل کڑا کر کے ناک بند کی اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کردیا۔ اس کے حلق سے اندر تک آگ کی ایک لہر سی کھنچ گئی مگر چند ہی لمحوں میں اسے ایسا لگا جیسے وہ ہلکی پھلکی ہوگئی ہو۔

اس دوران وہ شخص الماری کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس نے الماری کھولی۔ وہ پلٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک بہت خوبصورت لباس تھا۔ وہ شہناز کی طرف بڑھا۔ "تم یہاں کالج کی یونیفارم میں ہوئیں تو پہچان لی جاؤ گی۔ پولیس والے تلاشی پر بھی اصرار کرسکتے ہیں۔ تم جلدی سے یہ لباس پہن لو۔"

شہناز اب عجیب کیفیت میں تھی۔ اس کا ذہن پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ اس

نے وہ کپڑے لے لئے اور ادھر ادھر دیکھا۔ "کپڑے کہاں جاکر بدلوں؟" اس نے لڑکھڑاتی زبان میں پوچھا۔

"یہیں......... اسی کمرے میں۔ یہاں اور کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"تو آپ باہر چلے جائیں۔"

"ناممکن۔ جب تک تم کپڑے نہیں بدلو گی' میں باہر نہیں جاؤں گا۔" اس شخص نے درشت لہجے میں کہا۔ "دیکھو شہناز' اگر تم یہاں کالج کے کپڑوں میں برآمد ہوئیں تو میری پوزیشن خراب ہوجائے گی۔" شہناز کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ذہن ماؤف ہوگیا تھا۔

"یا تو تم کپڑے بدل لو یا پھر باہر جاکر پولیس والوں کا سامنا کرو۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ شہناز نے اس کے حکم کی تعمیل کے لئے اس کی طرف پیٹھ کی ہی تھی کہ وہ بولا۔ "نہیں......... اس طرف رخ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے سامنے ہی........."

اب شہناز کے پاس مدافعت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ سب کچھ سلولائیڈ پر منتقل ہورہا ہے۔ وہ دونوں ایک پوشیدہ کیمرے کے سامنے تھے۔

وہ اسے بھوکی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "تم تو بہت حسین ہو شہناز اور یہ لباس بھی تم پر بہت سج رہا ہے۔ پوری فلم انڈسٹری میں کوئی ہیروئن ایسی نہیں جس کے پاس تم جیسا حسن ہو۔ خیر' خود ہی دیکھ لینا۔ میں ذرا پولیس والوں کو نمٹا آؤں۔ تم یہاں اطمینان سے بیٹھو۔ میں فلم لگاتا ہوں۔ آرام سے فلم دیکھو۔"

بیڈ کے سامنے ٹی وی ٹرالی رکھی تھی۔ اس میں وی سی آر بھی تھا۔ اس شخص نے کیسٹ لگائی اور ٹی وی اور وی سی آر آن کرکے خود باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد شہناز بستر پر بیٹھ گئی اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ وہ ویسی ہی فلم تھی جس کی وجہ سے وہ اس مقام تک پہنچی تھی۔ وہ فلم دیکھتی رہی۔ وہ پوری طرح نشے میں تھی۔ اس وقت اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ پولیس والے بھی اسے یاد نہیں

رہے جن کے خوف سے وہ اس کمرے میں چھپی بیٹھی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ شخص واپس آگیا اور بے تکلفی سے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"پولیس والے ٹلے نہیں ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ تم کیسٹ لینے ضرور آؤ گی۔" اس نے کہا۔

شہناز پھر خوف زدہ ہوگئی۔ "تو پھر اب کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ تم آرام سے اوپر ہوکر بیٹھو اور فلم دیکھو۔ وہ مایوس ہوکر چلے جائیں گے۔ تب تم گھر واپس چلی جانا۔"

شہناز پھر فلم دیکھنے لگی۔ ذرا دیر بعد اس شخص کی دست درازیاں شروع ہوگئیں۔ شہناز کو زیادہ برا بھی نہیں لگا۔ کچھ شراب کا نشہ تھا اور کچھ اس فلم کا نشہ جو وہ دیکھ رہی تھی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ خود ایک فلم کی ہیروئن بن گئی ہے۔

کوئی تین گھنٹے بعد اس شخص نے کہا۔ "اب تم جاؤ۔ پولیس والے جاچکے ہیں۔"

شہناز کا نشہ اتر چکا تھا اور طبیعت بہت بگڑ رہی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس پر کیا بیت چکی ہے۔ وہ روئی دھوئی لیکن آخر اسے صبر آ ہی گیا۔

"جاؤ......... جاکر کپڑے بدل لو۔" اس شخص نے کہا۔ تب شہناز کو پتا چلا کہ اس کمرے میں ملحق باتھ روم بھی تھا۔ اس کے لئے باقاعدہ جال بچھایا گیا تھا۔ یہ اسے بعد میں پتا چلا کہ سائرہ بھی ان لوگوں کی آلہ کار تھی۔ اس پر یہ لوگ اسی انداز میں کئی سال پہلے قابو پاچکے تھے اور اس کے ذریعے جانے اس کے کالج کی کتنی لڑکیوں کو خراب کرچکے ہوں گے۔ تباہی اور بربادی کا وہ سلسلہ جانے کتنے گھروں تک پھیلا ہوا تھا۔

وہ کپڑے بدل کر باہر آئی تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے ایک اور دروازے کی طرف لے گیا۔ "اب کیسٹ لینے تم نہ آنا۔" اس نے کہا۔ "اپنی کسی سہیلی کو بھیجنا لیکن ایک ہفتے بعد' آج ہی کے دن یہاں ضرور آنا۔ نہیں آئیں تو پولیس تمہارے گھر پہنچ جائے گی۔" اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے ہی کوٹھی کا لان تھا......... اس کوٹھی کا جس میں وہ ویڈیو شاپ تھی۔ "سمجھ گئی ہو؟"

"سمجھ تو گئی ہوں لیکن........."

"آئندہ میرے سامنے لیکن وکین کبھی نہ کرنا۔" اس نے درشت لہجے میں کہا۔

"میں پولیس کو تمہارے گھر اور کالج سے دور صرف اسی صورت میں رکھوں گا کہ تم میری ہر بات مان لو۔"

شہناز اس ایک دن میں اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی ہوگئی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ اب اس کی سہیلیوں کی باری ہے مگر وہ کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس روز وہ گھر واپس چلی گئی۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے وہ کمرے میں بند پڑی رہی۔ اگلے روز وہ سائرہ کے گھر گئی۔ اس نے بتایا کہ اب وہ ویڈیو شاپ والے اسے فلم نہیں دیں گے۔ سہیلیوں کو کوئی تردد نہیں ہوا۔ انجم فلم لینے چلی گئی۔

ایک ہفتے بعد شہناز وہاں گئی۔ اس روز اسے معلوم ہوا کہ ویڈیو شاپ کے مالک کا نام توقیر حسین ہے۔ توقیر نے شہناز کو اس کی اپنی فلم کی چند جھلکیاں دکھائیں۔ شہناز لرز کر رہ گئی۔ "اب تم ہر روز کالج جاؤ گی۔" توقیر نے کہا۔ "پہلے پیریڈ کے بعد تم کالج سے نکل آیا کرو گی۔"

"لیکن گیٹ بند کردیا جاتا ہے اور چوکیدار.........."

"میں نے بات کرلی ہے۔ تم لوگوں کے لئے گیٹ کھل جایا کرے گا۔"

یوں شہناز اس جال میں پھنس کر ڈریم گرل سے کال گرل بن گئی۔ کالج میں ایک پیریڈ اٹینڈ کرکے وہ سائرہ کے گھر جاتی۔ وہاں فون پر توقیر کا بلاوا آجاتا تو وہ اس کی کوٹھی میں پہنچ جاتی۔ وہاں بڑے بڑے افسر تفریح کے لئے آتے تھے۔ وہی توقیر کے اثر و رسوخ ذریعہ تھے۔

اس صورت حال کے باوجود نہ جانے کیسے اس نے انٹر کرلیا۔ توقیر نے اُ یونیورسٹی میں داخلہ دلا دیا۔ اب وہ پوری طرح آزاد تھی۔

پھر اس کی زندگی کا وہ سیاہ دن آیا جس نے اس سے سب کچھ چھین لیا۔ اس را پولیس نے ایک بنگلے پر چھاپا مار کر پانچ لڑکیوں اور پانچ مردوں کو گرفتار کرلیا۔ اخبار اس کی تصویر چھپ گئی۔ پولیس پوری "تفتیش" کے باوجود یہ پتا نہ چلا سکی کہ وہ بنگلا ک نے کرائے پر لیا تھا اور کون وہ گھناؤنا کاروبار چلا رہا تھا۔ لڑکیوں نے خوف سے زبان نہ

کھولی اور "کسٹمرز" کو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔

ایسے میں بابر نے اسے چھڑایا' اس کی ضمانت کرائی۔ وہ بابر کے ساتھ ہی رہنے لگی۔ وہ گھر والوں کو کیا' کسی جاننے والے کو بھی منہ نہیں دکھا سکتی تھی۔ بعد میں اسے پتا چلا کہ اس کے ماں باپ اس کی تصویر اخبار میں چھپنے کے چھ ماہ کے اندر اندر مرچکے تھے اور بھائی مکان بیچ کر کہیں چلے گئے تھے۔ اب اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا.......... سوائے بابر کے۔

بابر کے کچھ عزائم تھے۔ وہ معاشرے کو سزا دینا چاہتا اور جلد از جلد زیادہ سے زیادہ دولت کما کر طاقتور بننا چاہتا تھا۔ اس کام کے لئے وہ ہر بڑے شہر میں یونٹ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ دہشت گردی کے بغیر یہ کام ممکن نہیں۔ شہناز نے کہا کہ وہ بھی اس یونٹ میں شامل ہونا چاہتی ہے۔ "اس کے لئے تمہیں اپنی اہلیت ثابت کرنا ہوگی۔ ایک آزمائش سے گزرنا ہوگا۔" بابر نے کہا اور اب آزمائش کا وقت آگیا تھا۔

وہ بابر کے ساتھ راولپنڈی چلی آئی تھی۔ اب اس کا نہ کوئی گھر تھا' نہ کوئی شہر' راولپنڈی میں ان کا یونٹ مکمل ہوگیا تھا۔ مشکور تو کراچی میں ہی بابر کے ساتھ تھا۔ وہ بابر کا ایسا مرید تھا جو اس کے ایک اشارے پر کچھ بھی کرسکتا تھا۔ اس میں عقل نام کی چیز نہیں تھی۔ وہ بس حکم کا بندہ تھا۔

راولپنڈی میں انہیں شہلا اور نذیر ملے۔ ان دونوں کے ساتھ بھی ایک ایک کہانی تھی۔ شہلا کی کہانی تو شہناز سے ملتی جلتی تھی۔ نذیر کو معاشرے کے دولت مندوں سے سنگین شکایات تھیں۔ اس کی بیٹی کو ایک سال پہلے بلڈ کینسر ہوگیا تھا۔ وہ ایک کارخانے میں معمولی کاریگر تھا۔ حکومت کے لوگوں سے لے کر عام دولت مندوں کے آگے تک ہاتھ پھیلاتا پھرا تھا مگر کہیں اس کی شنوائی نہیں ہوئی تھی اور اس کی ننھی بیٹی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگئی تھی۔

وہاں بابر نے شہلا کی آزمائش کی تھی۔ شہلا آزمائش میں پوری اتری تھی لیکن اس کا انداز بابر کو پسند نہیں آیا تھا۔

وہ دوپہر کا وقت تھا۔ وہ پانچوں گاڑی میں بیٹھے شہر سے باہر جارہے تھے۔ وہاں کھیت

ہی کھیت تھے۔ آبادی بہت کم تھی۔ اچانک بابر نے گاڑی روک دی۔ سامنے ہی کھیتوں میں ایک دہقان بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ بابر نے ڈیش بورڈ سے ریوالور نکال کر شہلا کو دیا اور سادگی سے کہا۔ "جاؤ.........اس شخص کو شوٹ کردو۔" شہلا متوحش ہوگئی۔ اس نے احتجاج کیا کہ وہ ایک معصوم آدمی ہے' اسے مارنے کا کیا فائدہ۔ اس پر بابر نے کہا کہ یونٹ میں شمولیت کے لئے یہ ضروری ہے ورنہ ابھی کار سے اتر جاؤ۔ ہم سے تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔

شہلا دل کڑا کرکے کار سے اتری اور دہقان کی طرف بڑھی۔ دہقان نے کھانا کھاتے کھاتے نظر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ اس نے ریوالور کو نظرانداز کر دیا جیسے وہ کوئی کھلونا ہو اور پھر کھانے پر جھک گیا۔ شہلا نے گولی چلائی۔ گولی دہقان کی آنکھوں کے درمیان پیشانی کے وسط میں لگی۔ وہ نوالہ ہاتھ میں لئے پیچھے کی طرف گرا۔ اس کے چہرے پر اس وقت بھی بے پروائی کا تاثر تھا۔ شہلا پر لرزہ چڑھ گیا تھا۔ وہ ہسٹریائی انداز میں چلاتی ہوئی کار کی طرف بھاگی۔ اس کے کار میں بیٹھتے ہی بابر نے کار دوڑا دی۔

وہ شاک شہلا پر کئی دن تک رہا۔ دہقان کا بے پروائی کے تاثر والا چہرہ اسے کئی دن ستاتا رہا۔ بابر کے نزدیک یہ کمزوری تھی۔ وہ شہلا کو ناپسند کرنے لگا۔

اور اب شہناز سوچ رہی تھی کہ وہ بابر کی ناپسندیدگی کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہ یونٹ ہی اب اس کا سب کچھ ہے.......... اس کی فیملی ہے..........

"چلو بھئی۔ اب چل دو۔" بابر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ آزمائش کا وقت آپہنچا۔

☆===========☆===========☆

کمال ان دنوں بہت پریشان تھا۔ پریشانی کی وجہ صوفیہ تھی۔ صوفیہ کے اور اس کے درمیان تلخی بڑھ گئی تھی۔ وجہ وہی تھی۔ صوفیہ کا کہنا تھا کہ وہ بعد میں ملازمت چھوڑ دے گی لیکن فی الحال صرف اس لئے اسکول کی جاب چھوڑ دینا کہ وہ شادی کررہی ہے' کچھ مناسب نہیں ہے۔ جبکہ کمال کا اصرار تھا کہ وہ شادی سے پہلے ہی استعفیٰ دے دے۔

فوج کے سابق کیپٹن کمال کی زندگی ابتدا ہی سے نشیب و فراز سے عبارت رہی تھی۔ اس نے ۶۷ء میں آرمی جوائن کی تھی تو اس کا مستقبل بہت تابناک تھا۔ وہ بہت اچھا فوجی تھا۔ اس کا ریکارڈ شاندار تھا۔ ۷۰ء میں اس کی پوسٹنگ مشرقی پاکستان میں ہوگئی۔ ۷۱ء کی جنگ میں عسکری بے بسی کے باوجود اس نے کئی کارنامے انجام دیئے۔ دسمبر میں وہ المیہ رونما ہوا جس کے نتیجے میں پاکستان کے ۹۰ ہزار فوجیوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہ جنگی قیدی بن گیا۔ اس ذلت آمیز قید کے دوران بھارتیوں نے پاکستانی فوجیوں کا مورال تباہ کرنے کے لئے وہ ہتھکنڈے استعمال کئے جو تاریخ پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رہائی کے بعد کمال نے ریٹائرمنٹ کا راستہ قبول کیا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اتنا پراعتماد اور سخت جان نہیں رہا جو پاکستان کے فوجی جوان کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

وطن واپسی کے بعد وہ ذاتی المیہ رونما ہوا جس نے اسے بھری دنیا میں اکیلا کردیا۔ اس کی واپسی کو دو سال ہوئے تھے اور وہ کراچی میں ایک کمرشل ادارے میں جاب کر رہا تھا کہ گاؤں میں نامعلوم افراد نے رات کو اس کے گھر پر حملہ کرکے اس کے پورے خاندان کو زندہ جلا دیا۔ اس کی پوری کائنات اس آگ میں جل گئی۔ ماں' باپ اور چھیتی بہن۔ وہ ملازمت چھوڑ کر گاؤں میں واپس آگیا۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ پولیس قاتلوں کا سراغ نہیں لگا سکی تھی۔ پہلے تو اس نے باقی زندگی انتقام کے نام کرنے کا ارادہ کیا مگر پھر اسے لاحاصل جانتے ہوئے اپنی زمین بیچ کر کچھ رقم اپنے پاس رکھی اور باقی فکس ڈیپازٹ میں رکھ دی۔ پھر اس نے ہمیشہ کے لئے آبائی گاؤں چھوڑ دیا۔

اس دوران اس نے کئی ملازمتیں کیں اور چھوڑیں۔ اس کا کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ بس کتابیں ہی اس کی دولت تھیں۔ انگریزی ادب اور فکشن سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ کمال یہ تھا کہ اس سب کچھ کے باوجود اس کی فطری خوش مزاجی رخصت نہیں ہوئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی اس کی زبان میں ماضی کا وہ زہر اتر آتا تھا جو اس نے چپکے سے پی لیا تھا۔

پچھلے پانچ سال سے وہ مری کے پائن ووڈ کانونٹ اسکول میں جونیئر اور سینئر کیمبرج کے طلباء کو انگریزی ادب پڑھا رہا تھا۔ صوفیہ بھی تقریباً ڈیڑھ سال سے اسی اسکول میں

پڑھا رہی تھی۔ دونوں بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ہوگئے۔ دونوں کے درمیان فیملی کا زیاں اور تنہائی ایک اہم قدر مشترک تھی۔ اس نے ان کے درمیان عمر کے فرق کو بھی مٹادیا۔ یہ الگ بات کہ کمال کی عمر ۴۴ سال تھی لیکن وہ تیس پینتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ اب زندگی میں پہلی بار وہ اپنے اجڑے ہوئے گھر کو آباد کرنا چاہتا تھا۔ اپنے باپ کی نسل کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔

اس صبح کمال اسکول کے دفتر میں پہنچا۔ سیکریٹری مسز جعفری نے مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا۔ "کمال.......... تم پہلے پرنسپل صاحب سے مل لو۔"

"خیریت؟ میرا خیال ہے مجھے نکالا جانے والا ہے۔" کمال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ اس کے برعکس وہ چاہتے ہیں کہ تم جاب چھوڑنے کا ارادہ ترک کردو۔ جاؤ' وہ اس وقت فارغ ہیں۔ مل لو۔"

کمال اسکول کے پرنسپل جمیل الرحمٰن کے کمرے کی طرف چل دیا۔ جمیل صاحب اسے پہلی ہی نظر میں بھا گئے تھے' اس لئے وہ اب تک یہاں ٹکا ہوا تھا۔ ورنہ اتنے عرصے اس نے کوئی جاب نہیں کی تھی۔

"آؤ کمال' بیٹھو۔" جمیل صاحب نے اس سے کہا۔ "کافی آنے ہی والی ہے۔"

"آپ یہ فرمائیں کہ مجھے اس ملاقات کا اعزاز کیوں حاصل ہو رہا ہے؟" کمال نے شگفتگی سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" جمیل صاحب نے دراز سے پاؤچ نکال کر پائپ بھرنا شروع کردیا۔ "یہ ملاقات تمہاری خواہش پر نہیں ہو رہی ہے؟"

کمال ہنسنے لگا۔ "پھر کوئی غلط فہمی ہوگئی ہوگی۔ میں چلتا ہوں۔"

"اب آگئے ہو تو بیٹھو۔" جمیل صاحب نے جلدی سے کہا۔ "یہ بتاؤ' مستقبل کے لئے کیا ارادہ ہے؟" وہ پائپ سلگانے لگے۔

"میں اب یہ جاب نہیں کرنا چاہتا۔"

"تو پھر؟"

"میں گاؤں جاکر زمین خریدنا اور وہاں گھر بسانا چاہتا ہوں.........."

"گھر تم یہاں بھی بسا سکتے ہو۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ لیکن میں پرانے گھر کی راکھ سے نیا گھر تعمیر کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم جیسے سمجھ دار آدمی سے ایسی جذباتیت کی امید نہیں تھی۔ سنو.......... صوفیہ سے تعلقات کیسے چل رہے ہیں؟"

"وہی جھگڑا ہے.......... جاب والا مگر اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ پہلی تاریخ کو میں ایک ماہ کا نوٹس دے رہا ہوں۔ اگلے ماہ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"مجھے تو امید نہیں۔" جمیل صاحب نے پائپ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "صوفیہ بہت پیاری' معقول اور سمجھدار لڑکی ہے اور تم اسے بہت پسند کرتے ہو۔"

"یہی تو مشکل ہے۔" کمال نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "پوری عمر میں ایک وہی تو پسند آئی ہے لیکن وہ بے کار کی ضد سے کام خراب کر رہی ہے۔ بہرحال میرا فیصلہ اٹل ہے۔"

"میرے خیال میں تو تم بے کار کی ضد کر رہے ہو۔ دیکھو' جب تم باپ بنو گے تو وہ خود جاب چھوڑ دے گی۔"

"چھوڑیے ان باتوں کو۔" کمال کا لہجہ اچانک تلخ ہوگیا۔ "یہ بتایئے' آپ نے کیوں بلوایا تھا مجھے؟"

جمیل صاحب بھی سنجیدہ ہوگئے۔ "بات یہ ہے کمال کہ میں اپنے سب سے اچھے ٹیچر کو کھونا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں وائس پرنسپل کے عہدے کی آفر کر رہا ہوں۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرو۔ تنخواہ بہت معقول ہوگی۔"

اسی وقت چپڑاسی کافی لے آیا۔ کمال سوچ میں پڑ گیا۔ اسکول بہت اچھا تھا۔ ملک بھر کے بڑے لوگوں کے بچے وہاں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔

"میرے پاس دو تجاویز ہیں تمہارے لئے۔" جمیل صاحب نے کہا۔ "ایک سال کی چھٹی لے لو اور اپنے آبائی گاؤں میں گھر بسالو۔ ایک سال تک میں کسی متبادل ٹیچر سے کام چلالوں گا۔ ایک سال بعد واپس آجانا۔ دوسری یہ کہ موسم گرما کی ایک ماہ کی چھٹیوں میں ہنی مون منا آؤ اور واپسی پر وائس پرنسپل کی ذمے داریاں سنبھال لو۔ یہاں زمین میں

تمہیں دلوا دوں گا۔ مکان کی تعمیر کے لئے اسکول سے قرضہ بھی مل جائے گا۔" کمال کچھ کہنے ہی والا تھا کہ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ "ابھی کچھ نہ کہو۔ سوچنے کے لئے تمہارے پاس بہت وقت ہے۔ صوفیہ سے بھی مشورہ کرلو پھر اطمینان سے مجھے حتمی جواب دے دینا۔ اب تم کافی پیو اور کوئی اور بات کرو۔ او کے؟"

کمال کافی پی کر وہاں سے اٹھ آیا۔ تیسری منزل پر اپنے کلاس روم کی طرف جاتے ہوئے اس کا سامنا صوفیہ سے ہوگیا۔ "شام ساڑھے چھ بجے.......... کیفے رم جھم میں۔" کمال نے گزرتے ہوئے کہا۔

صوفیہ رک گئی۔ "کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے، جھنجلا کر کہا۔ "اب بات کیا کرنی ہے؟"

"بات تو کرنی ہے۔ شام ساڑھے جھ بجے۔" کمال نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ گیا۔

وہ کلاس روم میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ طلباء کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ وہ سامنے کرکٹ اسٹیڈیم کی طرف دیکھتا رہا جو اب پھر سرسبز ہوگیا تھا۔ وہ سوچتا رہا۔ کیا اس کی زندگی میں بھی کبھی بہار آئے گی؟ لیکن صوفیہ کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔ آخر یہ صوفیہ اتنی ضدی کیوں ہے؟ پھر اس نے سوچا.......... ضد تو میں بھی کررہا ہوں۔ یہ نہیں سوچتا کہ اب میرے پاس ضد میں ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔ گھنٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ پیریڈ شروع ہورہا تھا۔ اب اسے کلاس لینا تھی۔

مسلسل تین پیریڈز نے اسے تھکادیا۔ وہ سگریٹ پینے کی غرض سے فیکلٹی لاؤنج کی طرف چل دیا۔ عمارت میں ہر منزل پر ایک فیکلٹی لاؤنج تھا لیکن پہلی منزل کے لاؤنج میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ جبکہ دوسری منزل کا فیکلٹی لاؤنج نان اسموکرز کے لئے تھا۔ چنانچہ وہ چوتھے خالی پیریڈ میں تیسری منزل کے فیکلٹی لاؤنج میں جاکر سگریٹ پیتا تھا۔

لاؤنج میں پی ٹی انسٹرکٹر مظفر خان پہلے سے موجود تھا۔ وہ بے حد بھاری بھرکم سابق فوجی تھا۔ کمال کو اس پر حیرت تھی کہ اس کی مظفر خان سے کیسے بنتی ہے کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے.......... بلکہ برعکس تھے۔ گرمی ہو یا سردی،

چے گیوارا، کاسترو اور ہوچی منہ کی سوانح پڑھنا ہیں۔"

"ماؤ کا حشر اور روس کا انجام دیکھنے کے باوجود؟" کمال نے زہرخند کہا۔ "ویسے بھی کیونزم سوشل اسٹڈیز کے تحت آتا ہے۔ ہم انگریزی ادب اور فکشن پڑھ رہے ہیں۔"

"میرے خیال میں ہم زندگی اور اس کے رویے پڑھ رہے ہیں۔" رئیس نے تند لہجے میں کہا۔ "اس ملک میں عام لوگ کتنے ناخوش ہیں.......... کتنے محروم ہیں۔ روس کے ختم ہوجانے سے کچھ بھی نہیں بدلا۔"

"سنو بیٹے، یہ سیاست دانوں اور حکمرانوں کا کام ہے۔ تم باہر نکل کر عملی زندگی کا آغاز کروگے تو سیاست دان بن جانا۔ پھر حکمران بننے کی کوشش کرنا اور اس کے بعد یہ سب کچھ ٹھیک کر دینا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس ملک سے محرومی، غربت اور دکھ کا خاتمہ کردوگے۔"

اس پر سب ہنسنے لگے۔ رئیس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "خدا کی پناہ.......... آپ تو اڑیل بیل ہیں۔"

"اس پر بعد میں بات ہوگی۔" کمال نے بڑے تحمل سے کہا۔

"یہ زحمت نہ کریں۔ میں یہاں رکوں گا نہیں۔ جب آپ اپنی ٹاپ فارم میں ہوتے ہیں، تب بھی سخت بور کرتے ہیں۔"

"تمہاری یہ پرفارمنس کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ بہرکیف ایک دن میں اتنی توہین بہت ہے۔"

"دوسرے لفظوں میں آپ مجھے شٹ اپ کہہ رہے ہیں؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔ تمہاری سمجھ داری پر مجھے کبھی شک نہیں رہا۔" کمال نے کہا۔ اس نے ایک اور راؤنڈ جیت لیا تھا۔ یہ سب کچھ کسی اور کلاس میں ہوا ہوتا تو رئیس کو کلاس سے نکال دیا جاتا لیکن کمال جانتا تھا کہ طالب علم کو کلاس سے نکال دیا جائے تو وہ کچھ بھی نہیں سیکھ سکے گا۔ یہ بات رئیس بھی جانتا تھا۔ چنانچہ باقی پیریڈ عافیت سے گزر گیا۔

سب لوگ کلاس سے نکلنے لگے تو نازیہ، رئیس کے ساتھ ہولی۔ "تم سر کمال کو اتنا

تنگ کرتے ہو رئیس؟"

رئیس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "ہمیں قائل کرنا ان کا کام ہے لیکن تم ان کی اتنی حمایت کیوں کر رہی ہو؟"

"دیکھو.......... وہ بہت اچھے آدمی اور بہت اچھے ٹیچر ہیں۔ وہ اس سلوک کے مستحق نہیں۔ غور کرو تو وہ بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔"

وہ سیڑھیوں کے قریب پہنچ گئے تھے۔ رئیس نے کہا۔ "مجھے وہ دلچسپ نہیں لگتے۔ ہمیشہ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے رہتے ہیں۔ کسی سے بات کرتے ہیں تو نظریں اس کے سر کے اوپر رکھتے ہیں۔ لگتا ہے' اس کے پیچھے دیوار سے باتیں کر رہے ہو۔ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں وہ۔ کاش کبھی وہ زمین پر آئیں اور ہماری بھی سنیں۔"

"تم پتہ نہیں' کہاں کی ہانک رہے ہو۔" نازیہ بولی۔ "وہ دوسرے ٹیچرز سے زیادہ اپنے طلباء کی سنتے ہیں۔ تم ان سے جو چاہے پوچھ سکتے ہو۔ مگر تم انہیں غصہ دلاتے رہتے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے' تم یہ سب کچھ دل سے نہیں کرتے ہو۔ بس زبردستی.........." یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

"ایک منٹ نازیہ۔" رئیس نے اسے پکارا۔ "یہ تم نے کیسے کہا.........." لیکن نازیہ دور چلی گئی تھی۔ رئیس کو اس کی بات حقیقت سے قریب تر لگی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ بے ساختہ کوئی ایسی بات کہہ دیتا تھا جو کمال صاحب کو پریشان کرے۔ نہ جانے کیوں؟ دوسری کلاسوں میں وہ اتنی بدتمیزی کرتا تو ٹیچر بھپر جاتے' تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے تھے لیکن کمال سب سے مختلف تھا۔ وہ ذہانت بھری یا پُرمزاح بات کو بے حد سراہتا تھا اور ایسی ویسی کسی بات پر طالب علم کو آرپار ہو جانے والی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔ وہ کبھی چیختا چلاتا نہیں تھا۔ غصہ بھی اسے کم ہی آتا تھا۔ لیکن اس کی زبان میں جانے کہاں سے ایسی تیز دھار آ جاتی تھی کہ طالب علم خود کو کتنا محسوس کرتا تھا۔ اس کا علاج رئیس نے یہ نکالا تھا کہ غیر متعلق یا ممنوعہ موضوع پر کمزور دلائل کے ساتھ تیز و تند بحث کرتا۔ ہٹ دھرمی' جہالت اور خود کو برحق سمجھنا.......... وہ انسانی کمزوریاں تھیں جنہیں کمال برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس چیلنج کا جواب دینا وہ ضروری سمجھتا تھا۔ اسے اس

بات کی پرواہ نہیں تھی کہ رئیس وزیر داخلہ کا بیٹا ہے۔

☆============☆============☆

وہ چاروں ساتھ ہی گھر سے نکلے.......... بابر' شہلا' شہناز اور نذیر۔ مشکور گھر میں ہی رہ گیا۔ وہ بڑی دلچسپی سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ گاڑی بابر ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے اس گاڑی پر فخر تھا۔ اس گاڑی کا باقاعدہ رجسٹریشن تھا۔ لائسنس بھی تھا مگر سب کچھ ایک جعلی نام سے۔ وہ بہت محتاط انداز میں ڈرائیو کر رہا تھا.......... ٹریفک کے تمام ضابطوں کا خیال رکھتے ہوئے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی خلاف ورزی پر نگاہوں میں آئے۔ اسے افسوس تھا کہ نذیر اس کے ماسٹر پلان پر عمل ہوتے نہیں دیکھ سکے گا۔ نذیر کو اب ایک اور کام کرنا تھا۔ زیادہ اہم کام۔ اس نے نذیر کو راستے میں ہی اتار دیا۔ بارش بہت تیز ہو رہی تھی لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔ بالآخر اس نے گاڑی روک دی۔ ایک لمحے وہ خاموش بیٹھا رہا۔ شہناز پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ جیسے کسی ٹرانس میں تھی۔ شہلا' بابر کے برابر بیٹھی تھی۔ اس کی انگلیاں مضطربانہ انداز میں ڈیش بورڈ پر تھرک رہی تھیں۔ "شہناز.......... تم تیار ہو؟" بابر نے پوچھا۔

"ہاں۔" شہناز نے بہت آہستگی سے کہا۔

"آواز سے تو نہیں لگتا۔" بابر نے کہا۔

"اب خوانخواہ اس کے پیچھے نہ پڑو۔" شہلا بولی۔ "وہ کہہ رہی ہے کہ تیار ہے تو تنگ کیوں کرتے ہو۔"

"میں واقعی تیار ہوں۔" شہناز نے کہا۔

"تمہیں بیس منٹ کار میں انتظار کرنا ہوگا۔" بابر بولا۔ "خوفزدہ مت ہونا۔ شہلا اور میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔ ہم پورے وقت تم پر نظر رکھیں گے۔ تمہیں سب کچھ یاد ہے نا؟"

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد شہناز نے کہا۔ "ہاں۔ مجھے یاد ہے۔"

بابر نے اس کا سر تھپتھپایا۔ "شہناز' تمہیں ہماری خاطر یہ کرنا ہوگا۔ مجھے یہ یقین ہونا چاہئے کہ میں تم پر اعتبار اور انحصار کر سکتا ہوں۔ مجھے یہ یقین دلانے کا یہ واحد طریقہ

ہے۔ شہلا پہلے ہی مجھے مایوس کر چکی ہے۔ اب تم مجھے مایوس نہ کرنا۔ دیکھو، جمعرات کو ہم ایکشن میں ہوں گے۔ مجھے یقین ہونا چاہئے کہ تم اپنا اہم کردار بخوبی ادا کرسکو گی۔ اپنی آج کی کارکردگی سے تم یہ بات ثابت کرسکتی ہو۔"

"میں یہ کام اس طرح کروں گی کہ تم مطمئن ہو جاؤ۔" شہناز نے سسکتی آواز میں کہا۔

بابر دروازہ کھول کر کار سے اتر آیا۔ "اس وقت ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ بیس منٹ بعد کار سے اترنا اور اپنا کام کر دکھانا۔"

ان کے جانے کے بعد شہناز کا چہرہ دیر تک بے تاثر رہا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ونڈ شیلڈ کے پار دیکھتی رہی۔ ریوالور اس کی گود میں رکھا تھا اور شہلا کی ناکامی کا منظر اس کی نگاہوں میں پھر رہا تھا۔ وہ خود کو بابر کی نظروں میں کمزور ثابت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی حقارت اور ناراضی کا تصور بھی اس کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے گروپ سے نکالا جائے۔

آٹھ بج کر پچاس منٹ پر وہ کار سے اتری۔ وہ لمبا رین کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ دونوں ہاتھ رین کوٹ کی جیبوں میں تھے لیکن رین کوٹ کی داہنی جیب کی سلائی ادھڑی ہوئی تھی۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ ریوالور والا ہاتھ اس نے اپنے لباس سے چپکایا ہوا تھا۔ وہ کامیابی کا عزم لے کر نکلی تھی۔ وہ بابر کی ناراضی سے خوفزدہ تھی لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنی اس فیملی سے جدا ہونا نہیں چاہتی تھی۔ کبھی کبھی اسے بابر دیوانہ لگتا تھا مگر جو کچھ بھی تھا، اب وہی اس کی فیملی تھی۔ وہ دنیا میں اکیلا رہنا نہیں چاہتی تھی۔

چنانچہ اب اسے کوئی شکار تلاش کرنا تھا!

☆============☆============☆

بابر اور شہلا سینما کے سامنے والے ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ سینما کا کمپاؤنڈ پوری طرح سے اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا اشوک........"

"شش........" بابر نے سرگوشی سے اسے ٹوکا۔ "ملا........ جب تک ہم یہ

ہیں، ہمیں اپنے اصلی ناموں سے گریز کرنا چاہئے۔"

"لیکن یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" ملا یا شہلا نے کہا اور واقعی ریسٹورنٹ سنسان تھا۔

"پھر بھی........" اشوک یا بابر نے کہا۔ "ہاں........ تم کیا کہہ رہی تھیں؟"

"مجھ سے وہ ہسٹریا کی اداکاری کیوں کرائی تم نے؟"

"لڑکی پر پریشر ڈالنا ضروری تھا۔ ویسے تم نے بہت اچھی اداکاری کی۔ ایک اچھی خبر ہے۔ گوپال سے فون پر بات ہوئی تھی۔ تمام بڑے شہروں میں ہمارے یونٹ مکمل ہو چکے ہیں۔ میری تجویز موثر ثابت ہو رہی ہے کہ ہر یونٹ پر مقامی لوگوں کو استعمال کیا جائے۔ ہماری پہلی کامیابی کے بعد بیک وقت تمام شہروں میں ایسی دہشت گردی ہوگی کہ اس ملک کی بنیادیں ہل جائیں گی۔"

"ہونا بھی چاہئے۔ ہم بھارت ماتا کی امید ہیں۔ ہم لوگوں کی تربیت پر بہت دولت صرف کی گئی ہے۔"

"دیکھو، شہناز کیا کرتی ہے۔" اشوک نے کہا۔

"مجھے یقین ہے، وہ کامیاب رہے گی۔" ملا بولی۔ "وہ تمہاری نظروں میں سرخرو ہونے کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہے۔"

اسی وقت انہیں شہناز سینما کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ "میری ٹائمنگ دیکھی تم نے۔" اشوک نے فخریہ لہجے میں کہا۔ اسی لمحے شو ختم ہوا اور کمپاؤنڈ فلم بینوں سے بھر گیا۔ "اب تو وہ مجھے نظر بھی نہیں آرہی ہے کاش یہ منظر میں قریب سے دیکھ سکتا۔"

☆============☆============☆

داؤد ۱۵ سالہ ازدواجی زندگی میں پہلی بار اپنی بیوی صادقہ کے ساتھ فلم دیکھنے آیا تھا۔ ورنہ وہ عام طور پر ٹی وی پر ہی فلم دیکھتے تھے۔ داؤد اس شام جلدی گھر آگیا تھا۔ اس کے ۱۴ سالہ بیٹے ہاشم اور ۱۲ سالہ بیٹی ہاجرہ کو مہندی کی ایک تقریب میں جانا تھا۔ یوں انہیں فلم دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ ابتدا میں ان کے مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ پھر

حالات بہتر ہوئے تو بچے بڑے ہو گئے تھے۔ ایسے میں فلم کے چونچلوں کا کسے خیال آتا۔ انہیں تو احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ زندگی کی مصروفیتوں اور بچوں کے مستقبل کی فکر نے انہیں ایک دوسرے سے کتنا دور کر دیا ہے۔

داؤد نے ٹکٹ خریدے تو بارش شروع ہو چکی تھی لیکن اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اس روز تفریح کے موڈ میں تھا۔ ہال میں بیٹھے بیٹھے اسے محسوس ہوا کہ اس کی عمر پندرہ برس کم ہو گئی ہے۔ فلم شروع ہوئی تو اس نے بڑی محبت سے صادقہ کا ہاتھ تھام لیا۔ صادقہ نے حیرت سے اسے دیکھا مگر اسے بھی یہ بہت اچھا لگا تھا۔ دونوں فلم میں کھو گئے۔ کامیڈی پر داؤد کھل کر ہنس رہا تھا اور ٹریجڈی پر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ فلم ختم ہوئی تو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ ہال سے نکلے۔ وہ بہت خوبصورت وقت تھا جو اس نے بہت طویل عرصے کے بعد بیوی کے ساتھ گزارا تھا۔ وہ دونوں ہی بہت خوش تھے۔ وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے باہر نکلے' تب بھی بارش ہو رہی تھی۔ داؤد نے چھتری کھول لی۔ ہجوم کے درمیان چلتے ہوئے داؤد کو احساس ہوا کہ وہ کبھی اتنا خوش نہیں رہا جتنا اس وقت ہے۔ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ یادگار لمحات گزارے تھے اور وہ ان کی حدت سے سرشار تھا۔

اچانک اس کے جسم میں جیسے اذیت کا کوئی چشمہ پھوٹ نکلا۔ اس کے ہونٹوں پر خون کا ایک بلبلہ سا پھوٹا اور اس نے دم توڑ دیا۔ وہ اپنے پیچھے کھڑی اس عورت کو نہیں دیکھ سکا جس کے داہنے ہاتھ میں سائلنسر لگا ریوالور تھا............

☆===========☆===========☆

شہناز کو معلوم نہیں تھا کہ وہ خصوصیت سے اس شخص کی طرف کیوں متوجہ ہوئی۔ شاید چھتری کی وجہ سے.......... یا اس کے محبانہ اور سرپرستانہ انداز کی وجہ سے جس سے وہ اپنی بیوی کو سہارا دیئے ہوئے تھا۔ یا شاید اس لئے کہ اس کے کندھے بہت چوڑے تھے۔ نشانہ خطا نہیں ہو سکتا تھا مگر اس لمحے ریوالور میں جیسے جان پڑ گئی۔ وہ رین کوٹ کے نیچے خود بخود بلند ہوا.......... اور فائر ہو گیا۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ اس میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ نہ کوئی آواز پیدا ہوئی' نہ کسی نے سر گھما کر

یکھا۔ وہ شخص آگے کی طرف گرا۔ اس کی بیوی چیخی۔ شہناز اپنی جگہ کھڑی رہی اس نش کو فرش پر گرتے دیکھتی رہی۔ "میں نے بڑی صفائی سے کام کر دیا۔" اس کے اندر سی نے کہا۔ "میں نے اپنی اہلیت ثابت کر دی۔"

لوگوں نے خود ہی اسے لاش سے دور دھکیل دیا۔ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا ں نے خصوصیت سے اس کی طرف دیکھا ہو۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی ٹھیک اک تھے۔ وہ بھی اتنا ہی چونکی تھی جتنا دوسرے چونکے تھے۔ اس شخص کے منہ سے کوئی واز نہیں نکلی تھی۔

بس پھر شہناز بڑی صفائی سے مجمع سے نکلی تھی۔ سینما سے باہر آ کر اس نے کار کی رف رخ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ لوگوں کو اب تک معلوم نہیں ہوا ہے کہ متوفی کو ٹ کیا گیا ہے۔

بابر بھی شہلا کو لے کر کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ وہ ئے واردات سے قریب تر ہو کر گزرے۔ کمپاؤنڈ میں گیٹ کے قریب وہ شخص بے حس رکت پڑا تھا۔ بابر نے اردگرد کھڑے لوگوں کے تبصرے دھیان سے سننے کی کوشش کی۔

"کیا خیال ہے بھئی.......... کیا معاملہ ہے؟"

"لگتا ہے' دل کا دورہ پڑا ہے بے چارے کو۔"

"میں اس کے پیچھے تھا کہ یہ اچانک آگے کی طرف گرا.........."

"ارے.......... یہ تو اس کے کوٹ کے نیچے سے خون نکل رہا ہے.........."

اس آخری تبصرے کے ساتھ ہی کمپاؤنڈ میں دہشت پھیل گئی۔

بابر اور شہلا کار تک پہنچے۔ شہناز پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بابر نے ڈرائیونگ ٹ سنبھالی اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔ شہلا اس کے برابر بیٹھ گئی۔ "میں تمہاری کارکردگی ، بہت متاثر ہوا ہوں شہناز۔" بابر نے کہا۔ "یہ بتاؤ' تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"بہت خوب! آج تو جشن ہونا چاہئے۔"

"یہ بتاؤ' میں ریوالور کا کیا کروں؟" شہناز نے پوچھا۔

"مجھے دے دو۔" بابر نے جیب سے رومال نکالتے ہوئے کہا۔ شہناز ریوالور د
نہیں چاہتی تھی تاہم اس نے ہچکچاتے ہوئے ریوالور رومال پر رکھ دیا۔ بابر نے ریوا
ڈیش بورڈ میں رکھ دیا......... رومال سمیت۔ اسے یقین تھا کہ اسے کبھی شہناز کے خلا
قتل کا وہ ثبوت استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مگر پھر بھی......... احتیاطاً!

☆==========☆==========☆

دوسری طرف نذیر نے اپنا کام مکمل کرلیا تھا۔ اس نے بڑی صفائی سے چرائی ہو
وین کا اگنیشن بدلا اور کھلے ہوئے تار سمیٹ کر ایک سوئچ سے منسلک کر دیئے۔ پھر ا
نے گاڑی کی نمبرپلیٹ ہٹا کر بابر کی دی ہوئی نمبرپلیٹ نصب کی۔ اس کے بعد وہ گاڑی۔
کر چل دیا۔

بارش اب بھی تیز ہو رہی تھی۔ نذیر نے وائپر چلا دیئے۔ وائپرز کی آواز سے ا
نیند آنے لگی۔ وہ اس وقت بہت پُرسکون تھا۔ طمانیت کا احساس غیر معمولی تھا۔ گا
گیراج میں کھڑی کرکے اس نے گیراج کے دروازے بند کئے اور مکان میں داخل ہو
مشکور بدستور ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ "یہ لوگ ابھی واپس نہیں آئے؟" اس نے مشکور۔
پوچھا۔

مشکور نے اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ "نہیں۔"

"کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہوگئی ہو۔" نذیر نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"بابر کے ہوتے ہوئے کوئی گڑبڑ نہیں ہوسکتی۔" مشکور نے بے حد اعتماد سے کہا

نذیر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "مجھے بابر کی فکر نہیں۔" اس نے کہا۔ "وہ تو محفوظ فا
پر ہوگا۔ میں شہناز کی طرف سے فکرمند ہوں۔ وہ بڑی آسانی سے غلطی کرسکتی ہے۔"

"تم وین لے آئے؟" مشکور نے پوچھا۔

"ہاں، گیراج میں کھڑی ہے۔" نذیر نے غور سے مشکور کو دیکھا۔ وہ بہت قنا
پسند اور آسانی سے مطمئن ہونے والا شخص تھا۔ بابر نے اسے سر چھپانے کا ٹھکانا،
بھرنے کو کھانا اور تفریح کے لئے ٹی وی فراہم کردیا تھا۔ وہ اس میں خوش اور مطمئن
اسے زیادہ کی ضرورت نہیں تھی۔ اتنی سی مہربانی پر وہ بابر کا غلام بن گیا تھا۔ اس نے

کے الزام میں جیل کاٹی تھی۔ جیل سے نکلتے ہی بابر نے اسے پٹا لیا تھا۔ بابر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر طرح سے اس کا خیال رکھے گا۔ وہ تنومند آدمی تھا بابر کے پیچھے دم ہلاتا چلتا تھا۔ اس کے ایک اشارے پر وہ کسی کو بھی قتل کرسکتا تھا۔ نذیر کو حیرت ہوتی تھی کہ بابر نے کیسے اسے قابو کیا ہے کہ اسے اپنے اشارے پر نچا سکتا ہے۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اس کا اپنا بھی یہی حال ہے۔ وہ بھی پوری طرح بابر کے قابو میں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ طبعاً وہ تشدد پسند نہیں ہے۔ جب بابر نے اس سے کہا تھا کہ اسے یونٹ میں شمولیت کے لئے قتل کرنا ہوگا تو وہ ہنس دیا تھا۔ وہ بابر پر نہیں ہنسا تھا' نہ اس بات پر ہنسا تھا کہ بغیر کسی وجہ سے کسی کو قتل کرنا کتنی عجیب بات ہے۔ بس وہ کسی کو قتل کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ مشکور کے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ بابر کے حکم پر کسی کو قتل کرسکتا تھا مگر پھر بابر نے اسے اس کی بیٹی اور پھر بیوی کی موت یاد دلائی' دولت مندوں کی بے حسی کا احساس دلایا۔ یوں وہ بھڑک گیا۔ رہی سہی کسر شراب نے پوری کردی۔ اس نے اپنے کارخانے کے مالک کو قتل کردیا لیکن وہ اب بھی یقین سے کہہ سکتا تھا کہ بابر اور شراب نہ ہوتے تو وہ کبھی قتل نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بغیر سہارے کے چلنے والا آدمی نہیں تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور بابر اندر آگیا۔ اس کے پیچھے دونوں لڑکیاں تھیں۔ وہ دونوں یقینی طور پر نشے میں دھت تھیں۔ "کم آن......... ہمیں جشن منانا ہے۔" بابر نے کہا۔

جشن رات گئے تک جاری رہا۔ بابر نے اس دوران شہناز کے کارنامے کی تفصیل متعدد بار دہرائی۔ نذیر نے کئی بار سونے کے لئے اٹھنا چاہا مگر بابر نے اسے اٹھنے نہ دیا۔

☆==========☆==========☆

صبح کے چار بجے تھے۔ کمال نے وہ بے خواب رات اسکول کے اسٹیڈیم میں گزاری تھی۔ وہ تنہا وہاں بیٹھا اسٹیڈیم میں ماضی کی یادوں کو متحرک دیکھ رہا تھا۔ پوری زندگی جیسے اس نے ایک بار اور گزار لی تھی اور اب وہ مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شام کو صوفیہ سے ملاقات اس کے نقطہ نظر سے نتیجہ خیز نہیں رہی تھی۔ وہ صوفیہ کو قائل نہیں کرسکا تھا۔ جمیل صاحب کی آفر نے اور پیچیدگی پیدا کردی تھی۔ صوفیہ کا اصرار

تھا کہ وائس پرنسپل کا عہدہ قبول کرلیا جائے اور مری میں ہی گھر بنایا جائے۔ "دکھوں کی زمین میں سکھ کے بیج بونے سے کیا فائدہ؟" صوفیہ نے دلیل دی تھی۔ وہ اپنے دلائل دہراتا رہا تھا لیکن بے سود۔ صوفیہ اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔

کمال جانتا تھا کہ وہ صوفیہ سے محبت کرتا ہے لیکن گاؤں واپس جاکر گھر بنانا اس کے لئے بہت اہم تھا۔ وہ اس سے دستبردار ہونا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ صوفیہ کو کھونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ صوفیہ نے یہ بات محسوس کرکے منصوبہ بندی کا شعبہ سنبھال لیا تھا۔ جون میں شادی' پھر ہنی مون اور واپسی پر کمال احمد وائس پرنسپل۔ وہ انکار بھی نہ کرسکا کہ صوفیہ کا دل نہ ٹوٹ جائے اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی منصوبہ بندی کے بعد صوفیہ کا دل ٹوٹنا کتنا اذیت ناک ہوگا۔

رات کی تاریکی ہلکی پڑگئی۔ آسمان پر ملگجا اجالا پھیل گیا۔ وہ وہیں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ اسے یقین ہوگیا کہ اسکول کھل گیا ہے اور اب گرم کافی مل سکتی ہے۔ پھر وہ گھاس پر چلتا ہوا اسکول کی عمارت کی طرف بڑھا۔ دو گھنٹے وہ اوپر والے فیکلٹی روم میں بیٹھا پرچے جانچتا رہا۔ اس دوران اس نے کافی کی کئی پیالیاں پی ڈالیں اور سگریٹ کا پورا پیکٹ پھونک ڈالا۔

اس روز اس نے اپنی کلاسوں کو ایک اسائن منٹ دے کر مصروف رکھا۔ اس کا بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ تینوں پیریڈ ختم ہوئے تو اس نے سکون کی سانس لی اور کافی اور سگریٹ پینے کے لئے چل دیا۔ اس کے لئے وہ دن سسک سسک کر گزر رہا تھا۔

لاؤنج میں مظفر خان اس کے سر پر سوار ہوگیا۔ "جانتے ہو' آگ لگ جانے کی صورت میں یہ جگہ ایک قید خانہ ہے۔" مظفر نے بلا تمہید کہا۔ "دیکھا ہے کہ زینے کتنے تنگ ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آگ لگ جائے تو بچوں کو کیسے نیچے اتارا جائے گا۔ آگ سے بچاؤ والے زینے بھی ردی ہیں۔ میرا خیال ہے' ان پر دو آدمی ایک ساتھ کھڑے ہوجائیں تو یہ ڈھے جائیں گے۔"

کمال نے پرچے سے نظریں اٹھائیں اور بولا۔ "میں نے کبھی غور نہیں کیا اس پر

لیکن میرا خیال ہے تم مبالغے سے کام لے رہے ہو۔"

"تمہیں کیا معلوم۔ صبح سے میں بھگت رہا ہوں۔ اچانک انسپکشن والے آگئے۔ مجھ سے انہوں نے کیا کیا کام کروائے۔ اسٹور سے کھیلوں کا تمام سامان نکلوا دیا جبکہ سامان رکھنے کی متبادل جگہ بھی فراہم نہیں کی۔ یہ فکر صرف اس لئے کہ یہاں وزیروں' مشیروں اور بڑے لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ کبھی کسی عام اسکول کی تو فکر نہیں کی جاتی۔ اس ملک میں قانون بھی مختلف طبقوں کے لئے مختلف ہے اور مراعات بھی۔ انصاف تو نام کو نہیں!"

کمال پرچے چیک کرتا رہا۔ مظفر کو بھی اندازہ ہوگیا کہ اس وقت وہ سننے یا بولنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ وہ اسپورٹس کا ایک میگزین کھول کر بیٹھ گیا۔

☆===========☆===========☆

مطلب کے ٹھکانے کی تلاش میں بابر تنہا ہی نکلا تھا۔ ہوٹلوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور ابھی سیزن بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اسے توقع تھی کہ کوئی دشواری نہیں ہوگی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسے مخصوص لوکیشن درکار تھی۔ کوئی ہوٹل اس معیار پر پورا نہیں اترا تو وہ مایوس ہونے لگا۔ پھر اسے وہ نو تعمیر شدہ اپارٹمنٹ نظر آگئے۔ پہلی دو عمارتیں مطلوبہ رخ پر نہیں تھیں۔ وہ تیسری اور آخری عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں بات نہ بننے کی صورت میں اس کے لئے مسئلہ کھڑا ہوجاتا۔ وہ دروازے پر کھڑا کچھ دیر سوچتا رہا پھر آفس میں داخل ہوگیا۔ وہاں ایک معمر شخص میز کے پیچھے بیٹھا تھا۔ وہ مقامی آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ پھر وہ بولا تو اس بات کی تصدیق ہوگئی۔ "فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

"میرا نام بابر سلیم ہے۔ ایک اپارٹمنٹ چاہئے مجھے۔" بابر نے کہا۔

"یہاں بیشتر اپارٹمنٹ لوگوں کی ملکیت ہیں۔" منیجر نے کہا۔ "یہ اسی اسکیم کے تحت بنائے گئے تھے۔ مالک جس وقت چاہیں یہاں آسکتے ہیں.......... وہ مالکانہ قبضے کے ساتھ بھی مل سکتے ہیں اور کرائے پر بھی۔"

"پلیز.......... مجھے دکھا دیجئے ذرا۔"

منیجر نے ایک رجسٹر کھول کر دیکھا پھر دراز میں سے چابیاں نکالیں اور بولا۔ ”آیئے میرے ساتھ۔“

وہ اسے پہلی منزل پر لے گیا۔ وہاں اس نے بابر کو تین اپارٹمنٹ دکھائے۔ وہ دو کمرے والے اپارٹمنٹ تھے............ اٹیچڈ باتھ کے ساتھ۔ کھڑکیوں سے بہت خوبصورت منظر نظر آتا تھا لیکن وہ بابر کے مطلب کے نہیں تھے مگر وہ منیجر کو کیسے بتاتا کہ اس کی ضرورت کیا ہے۔ ”تین کمروں والے اپارٹمنٹ نہیں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ دوسرے رخ پر ہیں............ اور تیسری اور چوتھی منزل پر ہیں۔“ منیجر نے کہا۔ ”لیکن میں نے بتایا نا‘ وہ لوگوں کی ملکیت ہیں۔“

بابر کا دل خوش ہوگیا۔ اسے عمارت کے دوسرے رخ میں ہی دلچسپی تھی۔ اس نے کہا۔ ”آپ کو انہیں کرائے پر دینے کا اختیار نہیں؟“

”ہے۔ وہ کرایہ ہمارے پاس مالکوں کی امانت ہوتا ہے۔ اس میں ایک خطرہ ہے۔ وہ کسی وقت آگئے تو آپ کو اپارٹمنٹ خالی کرنا ہوگا۔“

”میں یہ رسک لے سکتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔“

منیجر چند لمحے ہچکچایا پھر بولا۔ ”ان کا کرایہ زیادہ ہوگا۔“ پھر اس نے وضاحت کی۔ ”دیکھیں نا‘ کرایہ تو مالکوں کا ہوگا۔ ہمارا محنتانہ الگ............“

”آپ اس کی فکر نہ کریں۔ مجھے اپارٹمنٹ دکھادیں۔“

آپ یہیں رکیں‘ میں چابی لے کر آتا ہوں۔“

تھوڑی دیر میں منیجر چابی لے آیا۔ اس نے تیسری منزل پر دوسرے رخ کا اپارٹمنٹ کھولا۔ ”ویسے لوگ عام طور پر مشرق کی سمت والے اپارٹمنٹ پسند کرتے ہیں۔“

”مجھے مغرب والا زیادہ اچھا لگے گا۔“

وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوگئے۔ بابر نے ہر چیز چیک کی۔ اپارٹمنٹ واقعی اچھا تھا۔ فرنیچر بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ لائٹیں موجود تھیں۔ وہ سرسری انداز میں کھڑکی کے پاس گیا۔ حالانکہ اس کے لئے سب سے زیادہ دلچسپی کی چیز وہی تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر کا منظر

دیکھا اور پوری طرح مطمئن ہوگیا۔

”اس کا کرایہ کتنا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”چار ہزار روپے۔“

بابر نے منیجر کو گھور کر دیکھا۔ ”چار ہزار............“

”سیزن میں تو دس ہزار ملتا ہے اس کا۔“ منیجر نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ”دیکھئے فرنیشڈ اپارٹمنٹ ہے۔“

”اور اگر ہم صرف ہفتہ دو ہفتے رہیں تو؟“

”کرایہ تو ایک ماہ کا ہی چارج ہوگا۔“

”اور اگر ہمیں وقت سے پہلے مالک کی آمد کی وجہ سے اپارٹمنٹ خالی کرنا پڑا تو؟“ بابر نے دکھاوے کی حجت کی۔ اسے تو اپارٹمنٹ بس دو دن کے لئے چاہئے تھا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ منیجر کسی زاویے سے مشکوک ہو۔

”تو ہم آپ کو متبادل اپارٹمنٹ دیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ بابر نے جیب سے بٹوا نکالا اور چار ہزار روپے گن کر منیجر کو دے دیئے۔ منیجر نے اسے چابی دے دی۔

بابر دوپہر کو پنڈی واپس پہنچ گیا۔ اس نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ اپارٹمنٹ اسے کتنی دشواری سے ملا ہے۔ اس نے چابی شہناز کو دے دی۔ ”میں چاہتا ہوں‘ کل تم اس اپارٹمنٹ میں پہنچ جاؤ۔“ اس نے کہا۔

رات کے کھانے کے بعد اس نے شہناز اور شہلا کو کچن میں دھکیلا۔ مشکور ٹی وی میں مگن تھا۔ وہ نذیر کے ساتھ اگلے دو روز کے پروگرام کی تفصیل طے کرنے بیٹھ گیا۔

”کل ہمیں ساری سیٹنگ کرنا ہوگی۔ جمعرات کی صبح تو بہت مصروف ہوگی۔“

نذیر بہت توجہ سے سنتا رہا۔ وہ بابر کے فیصلوں پر کبھی اعتراض نہیں کرتا تھا‘ کوئی اعتراض ہوتا بھی تو وہ اندر ہی رہتا۔ مثلاً اس کے خیال میں سینما والا قتل حماقت تھی۔ اس کے نتیجے میں یہ بھی ممکن تھا کہ پولیس ان تک پہنچ جاتی لیکن اس نے اپنا منہ بند ہی رکھا۔ ابھی تک تو بابر کی بات درست ثابت ہو رہی تھی۔ پولیس کے پاس ایسا کوئی سراغ

نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ اس قتل کا تعلق ان سے جوڑتی۔ سب سے بڑی بات یہ اس نے ان لوگوں کو یکجا کر کے اچھا یونٹ بنایا تھا۔ پھر اس نے اور شہروں میں یونٹ بنا کے لئے بھرپور انداز میں کام کیا تھا۔ اس نے ایسے سزا یافتہ لوگوں کی فہرست بنائی تھی؛ سنگین جرائم میں ملوث تھے اور حال ہی میں رہا ہونے والے تھے۔ اس نے ان سے رابط کیا تھا اور اب اس کا دعویٰ تھا کہ ہر بڑے شہر میں یونٹ قائم ہو چکا ہے۔ اس یونٹ کی کامیابی کے بعد ان سب کو حرکت میں آنا تھا۔

بابر کا منصوبہ بہت سادہ تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی چوریوں اور ڈکیتیوں کے ذریعے بڑی واردات کے لئے فنانس فراہم کیا تھا۔ نذیر کو اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ جمعرات کو وہ جو کچھ کرنے والے تھے' وہ بہت بڑا کام تھا اور بابر کے خواب تو اس سے بھی آگے کے تھے۔ اس نے ایک اور گروپ تشکیل دیا ہوا تھا۔ ضرورت پڑنے پر وہ انہیں بیک کرتا۔ وہ خالص دہشت گردوں والی ٹیکنیک تھی۔ بابر کا کہنا تھا کہ عنقریب ملک بھر میں اس کے بیسیوں یونٹ کام شروع کر دیں گے۔ بتدریج پورا ملک تشدد اور دہشت گردی کی لپیٹ میں آ جائے گا اور تمام یونٹ اپنی کارروائیوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والی دولت کے بل پر طاقت ور ہوتے جائیں گے۔

نذیر کو اس سے غرض نہیں تھی کہ بابر کے خواب کہاں تک جاتے ہیں۔ وہ تو خطیر رقومات کے تذکرے سے مسحور ہو کر رہ جاتا تھا۔ اب اسے صرف دولت کی ہوس تھی۔ دولت اس کی بچی اور بیوی کو واپس تو نہیں لا سکتی تھی لیکن نذیر اب کبھی اس بے بسی سے دوچار نہیں ہونا چاہتا تھا جو بچی کی بیماری کے عرصے میں اس پر طاری رہی تھی۔ پھر اب اس کی زندگی ایک بہت بڑے اور مہیب خلا کی طرح تھی۔ بابر نے اس خلا کو ایڈونچر کے احساس سے بھر دیا تھا۔

بابر خاموش ہوا تو نذیر کا جاگتی آنکھوں کا وہ خواب ٹوٹ گیا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ بابر کی بات توجہ سے سن رہا تھا کوئی سوال کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے پوچھا۔ "ہم دھماکے والے چارج کب بنائیں گے؟"

"ابھی.......... اسی وقت۔" بابر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں بہت محتاط رہنا ہو گا۔

ایک غلطی بھی ہو گئی تو جمعرات کی نوبت نہیں آئے گی۔"

اگلے آدھ گھنٹے میں بابر نے بموں کے مختلف حصے یکجا کئے جو مکان کے مختلف حصوں میں چھپائے گئے تھے۔ پھر اس نے ڈائنامائٹ نکالا۔ نذیر کو اس قسم کے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بس وہ بچپن میں دیا سلائی کا مسالہ سوراخ والی چابی میں جمع کر کے کیل کی مدد سے پٹاخے چلاتا رہا تھا۔

بابر نے پہلے اسے تفصیل سے سمجھایا اور ہدایات دیں۔ اس کے بعد اس نے اسے ہاتھ بٹانے کی اجازت دی۔ اس کے باوجود وہ اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ کوئی بھی غلطی مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ بابر کو تین بم درکار تھے۔ ہر بم میں ڈائنامائٹ کی پندرہ اسٹک تھیں اور وہ چاہتا تھا کہ اسٹکوں کو ایسے باندھا جائے کہ وہ ڈھیلی نہ ہوں۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ ٹریگر کئے جانے کے بعد بم پھٹیں گے' اس نے بڑی احتیاط سے اسٹک کے تینوں بنڈلوں سے تین علیحدہ بلاسٹنگ کیپ منسلک کر دیئے۔ کیپ لگانے کے بعد اس نے تینوں کے لیڈ وائرز کو رسی کی طرح بٹ دیا۔

"اب میں تمہیں اس کا اصول سمجھاتا ہوں۔" بابر نے نذیر سے کہا۔ "ہمارے لئے ٹائم بم بیکار چیزیں ہیں۔ ہمیں ان بموں پر مکمل کنٹرول حاصل ہونا چاہئے ورنہ یہ ہمارے لئے کسی کام کے نہیں ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ پولیس کو بہت جلد اس بات کا احساس ہو جائے گا۔ چنانچہ اپنی اس مضبوطی کے لئے ہم ان تمام یونٹوں کو ایک بیٹری سے منسلک کریں گے.......... اور اس کے بعد ایک ٹرانزسٹر ریڈیو سے یہ کام بہت سادہ ہے۔ میرے پاس مخصوص فریکوئنسی کا ٹی وی ریموٹ کنٹرول یونٹ ہے۔ اس کا سگنل ریڈیو پکڑے گا۔ پھر ریڈیو بیٹری کو ایکٹی ویٹ کر دے گا۔ بیٹری اس الیکٹریکل چارج کو ریلیز کرے گی جو بلاسٹنگ کیپ کو ٹریگر کرے گا لیکن یہ سادہ سا کام اتنا آسان نہیں ہے۔ ابھی ہمیں وائرنگ کرنی ہے اور بیٹری یوں کسی بھی وقت چارج دے سکتی ہے۔ لہٰذا ہمیں آف کرنے والا سوئچ لگانا ہو گا۔" یہ سب کچھ کہتے ہوئے وہ انگلیوں سے میز پر ڈایا گرام بھی بنا رہا تھا۔ "اس لئے ہمیں ویسا ہی وارم اپ سوئچ استعمال کرنا ہو گا جیسا ٹی وی سیٹ میں ہوتا ہے۔ تم نے یقیناً دیکھا ہو گا۔ بٹن دبایا اور ٹی وی آف۔ دوبارہ دبایا تو ٹی وی آن۔ اس

سوئچ کو ہم آف پوزیشن میں لگائیں گے۔ ریڈیو سے موصول ہونے والا سگنل اسے ایکٹی ویٹ کرے گا۔" اس دوران بولنے اور ڈایا گرام بنانے کے درمیان وہ وائر بھی سیٹ کررہا تھا۔ اسے کسی چیز کی مثلاً وائر کٹر' اسکریو ڈرائیور اور سولڈرنگ آئرن کی ضرورت ہوتی تو وہ نذیر سے طلب کرتا۔

"ہاں.......... بات سنو۔ ایک بات مجھے یاد دلادینا۔" بابر نے کہا۔ "جب میں لیڈ کو بیٹری سے جوڑنے لگوں تو مجھے یہ ضرور یاد دلادینا کہ سوئچ کو ٹیسٹ کرلوں۔ کہیں چارج لیک نہ ہورہا ہو۔"

"اور اگر کوئی بھولا بھٹکا سگنل اس فریکوئنسی پر آگیا تو؟" نذیر نے اعتراض کیا۔

بابر نے نظریں اٹھاکر اسے دیکھا اور عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "یہ امکان تو ہمیشہ موجود رہتا ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا جیسے اس جملے کی اہمیت نذیر پر اجاگر کرنا چاہتا ہو۔ "لیکن میں نے فریکوئنسی بہت احتیاط سے منتخب کی ہے۔ اس کے باوجود موسم کی خرابی کی صورت میں گڑبڑ ہوسکتی ہے۔ کیوں' تمہیں خوف آرہا ہے؟"

"ہاں۔ اس پر تو ہمارا کنٹرول نہیں ہے نا۔" نذیر نے کہا۔

"دیکھو' جب تک ریڈیو آف ہے' یہ مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہاں ریڈیو آن کرنے کے بعد' ہم قسمت کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ انسان جتنی احتیاط کرسکتا ہے' وہ میں نے کی ہے۔ آگے بھگوان جانے.........." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ اس کے منہ سے کیا نکل گیا ہے۔ اس نے نذیر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ حیرت سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ "بات یہ ہے کہ میں برے کام میں اللہ کا نام کبھی نہیں لیتا۔" وہ مسکرایا۔ "ایک اچھے مسلمان کی طرح میں برائی کافروں کے خدا پر تھوپ دیتا ہوں۔" اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

نذیر مسکرانے لگا۔ "لیکن اگر ایسا ہوگیا تو کیا ہوگا؟"

"سوائے اس کے کچھ نہیں ہوگا کہ ہمارے چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔" بابر نے بے پروائی سے کہا۔ "اہم بات یہ ہے کہ اس کے زور پر ہم اپنی بات منوا سکتے ہیں۔" اس نے ٹریگر ڈیوائس کی وائرنگ مکمل کرلی تھی۔ "اب بس ہمیں لیڈ کو سوئچ سے منسلک کرنا

پھر کام مکمل۔ ذرا سولڈرنگ آئرن بڑھانا۔ یہ نازک کام ہے۔" اس نے پہلا بم مکمل کرلیا۔

اس دوران نذیر کی نظر کچن سے نکلتی ہوئی شہناز پر پڑ گئی۔ وہ دونوں بہت کم وقت میں ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔ بابر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اسے تو اس پر بھی اعتراض نہیں تھا کہ وہ شہلا کے ساتھ کھیلتا رہا ہے لیکن شہناز' نذیر کو اور انداز میں اچھی لگی تھی۔ اسے اس پر ترس بھی آتا تھا۔ بے چاری نے کہاں سے زندگی شروع کی' کیسے دولت والوں کے ہاتھ برباد ہوئی اور کہاں تک آپہنچی۔ نذیر نے سوچا تھا کہ پیسہ ہاتھ میں آتے ہی شہناز سے شادی کرکے پُرسکون زندگی گزارے گا..........

اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ "اے بابر.......... تمہیں پہلے کچھ اور کرنا تھا!" وہ تقریباً چلا اٹھا۔

بابر کے ہونٹ بھینچ گئے۔ "ہاں.......... ذرا مجھے ٹیسٹر دو۔" اس نے ٹیسٹر کی مدد سے دوسرے بم کے تار سوئچ پر رکھے۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے اسی طرح تیسرے بم کے سوئچ کو چیک کیا۔ اس بار ٹیسٹر کا دستہ روشن ہوگیا۔ "تیسری چیز ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ اگلے چند منٹوں میں وہ تیسرے سوئچ کی دوبارہ وائرنگ کررہا تھا۔ نذیر کو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔ دوبارہ وائرنگ کرکے اس نے سوئچ کو پھر چیک کیا۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے لیڈ جوڑ دی۔

نذیر کو یہ احساس بہت دیر بعد ہوا کہ کیا ہوا تھا اور جب احساس ہوگیا تو اس نے دم سادھ لیا۔ بابر نے ان سب کو چیتھڑے اڑانے کے بہت قریب پہنچادیا تھا۔ یہ سوچ کر اس کے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی کہ ان کے منصوبے میں ایسی کوئی گڑبڑ ہوسکتی ہے۔ کوئی ایسی بات جس کے متعلق انہوں نے سوچا بھی نہ ہو۔ سب سے زیادہ وہ اس بات پر پریشان تھا کہ بابر سے غلطی سرزد ہوئی ہے جبکہ وہ پوری طرح بابر پر انحصار کررہے تھے۔ دوسرے تو اس کی ہدایات پر عمل کرتے مگر بابر کے لئے درست فیصلے کرنا ضروری تھا۔

بابر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "تمہارا رنگ پیلا پڑ گیا ہے نذیر۔"

"ہم بال بال بچے ہیں۔" نذیر نے لرزتی آواز میں کہا۔

بابر کے ہونٹوں کا ایک گوشہ اوپر اٹھ گیا۔ "یہ تمہاری غلطی تھی۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ سوئچ چیک کرنے کے بارے میں مجھے یاد دلا دینا۔ میں جب کسی سے کچھ کہتا ہوں تو توقع رکھتا ہوں کہ تعمیل کی جائے گی۔ میں نے تمہیں ہدایت دینے کے بعد مطمئن ہو کر سوئچ والے معاملے کو اپنے ذہن سے دھکیل دیا تھا۔ مجھے تم پر بھروسا تھا نذیر لیکن تم نے مجھے مایوس کیا۔ اب بتاؤ' میں کس حد تک تم پر اعتماد کرسکتا ہوں؟"

نذیر کے وجود میں غصہ ابلنے لگا لیکن اس نے خود کو پھٹ پڑنے سے باز رکھا۔ اس نے بابر کی سرخ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کمزور لہجے میں کہا۔ "آئی ایم سوری۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔" بابر نے کہا۔ "اب میں تمہیں بے ضرر سا کام سونپ رہا ہوں۔ گنوں کی صفائی کردو۔ گن تو ہینڈل کرسکتے ہو تم؟"

نذیر نے جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور عقبی بیڈ روم میں چلا گیا۔ کچن کی طرف سے بابر کی آواز آرہی تھی۔ وہ شہلا اور شہناز کو اس واقعے کے متعلق بتارہا تھا۔ وہ بیس منٹ تک انہیں غلطیوں اور ان کے نتائج پر لیکچر دیتا رہا۔ نذیر نے اس کی آواز پر اپنی سماعت کے دروازے بند کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز جیسے براہ راست اس کے دماغ میں گھسی جارہی تھی۔ اس کے اندر غصے کا آتش فشاں ابلنے لگا۔ ایسا غصہ اسے پہلے کبھی نہیں آیا تھا.......... سوائے اس وقت کے جب اس کی بچی مری تھی۔ وہ بیڈ کی پٹی پر بیٹھا پوری جان سے لرزتا رہا لیکن وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اسے غصہ پینا ہی تھا۔

☆==========☆==========☆

جمیل الرحمٰن نے سیکریٹری مسز جعفری کو اپنے کمرے میں یہ کہہ کر بلایا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کافی پئے۔ اب وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ پائپ کے کش لئے جارہا تھا۔

"مجھے کافی کی دعوت دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ دوسروں کی ٹوہ لینے کی فکر میں

ہیں۔" مسز جعفری نے کہا۔

"خیر.......... میں اتنا مطلبی بھی نہیں ہوں۔" جمیل الرحمٰن نے کہا۔ "بہرکیف میں کمال اور صوفیہ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

مسز جعفری ہنسنے لگیں۔ "دیکھا آپ نے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ بتائیں' آپ ان میں سے کس کا نقطہ نظر جاننا چاہتے ہیں؟"

"کمال سے تو میں بات کرچکا ہوں۔ صوفیہ کی سناؤ۔"

"صوفیہ بہت پریشان تھی۔" مسز جعفری نے بتایا۔ "اس کا خیال تھا کہ کمال گاؤں کی بات صرف اس سے شادی سے بچنے کے لیے کررہا ہے مگر اب صورت حال کچھ بدل گئی ہے۔ صوفیہ نے اپنی دانست میں کمال کو وائس پرنسپل کا عہدہ قبول کرنے اور گاؤں سے دستبردار ہونے پر آمادہ کرلیا ہے۔ اس کا پروگرام موسم گرما کی چھٹیوں میں شادی کرکے ہنی مون کے لئے یورپ جانے کا ہے.........."

"میرے لئے یہ بڑی خوشخبری ہے۔"

"لیکن صوفیہ اتنی خوش ہے کہ اسے کچھ نظر ہی نہیں آرہا ہے۔ کمال بہت پریشان ہے۔ وہ خوش نظر نہیں آتا حالانکہ اسے خوش ہونا چاہئے۔"

"اپنے کسی خواب سے دستبرداری پر مجبور ہونے والے کا ردعمل یہی ہوسکتا ہے۔" جمیل صاحب بولے۔

"ممکن ہے۔ لیکن اس کے انداز سے نہیں لگتا کہ وہ دستبردار ہوگیا ہے۔ مجھے تو وقت تک اس شادی کا یقین نہیں آئے گا جب تک یہ شادی ہو نہیں جاتی۔" مسز ری نے کہا۔ "اور ایک مشورہ میں آپ کو بھی دوں گی۔ آپ ان لوگوں کی اتنی زیادہ نہ کریں۔ ٹیچرز آتے جاتے رہتے ہیں۔ متبادل مل جاتے ہیں۔ آپ پُرسکون رہنے کی ڈالیں ورنہ بیمار ہوجائیں گے۔"

"شکریہ مسز جعفری۔"

"نہیں۔ آپ واقعی بہت پریشان ہوتے ہیں۔" مسز جعفری نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "........ اب میں چلتی ہوں۔"

☆============☆============☆

گھنٹی بجی تو کمال اپنا لنچ باکس خالی کر کے رکھنے کے بعد اپنی کلاس میں چلا آیا۔ اس کی صبح کی کلاسیں بہت اچھی رہی تھیں۔ طلباء تعاون کے موڈ میں تھے۔ شور شرابا بالکل نہیں ہوا تھا۔ خود کمال کا موڈ بھی بہت اچھا تھا۔ لیکچر دینے کے لئے وہ بہت مناسب دا تھا۔

تمام طلباء اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو کمال نے کہا۔ "اب تک ہم جنگ پر، جو احتجاج کی انتہائی شکل ہے، کئی ناول پڑھ چکے ہیں۔ اب میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہو کہ جنگ کیا ہے؟"

کلاس میں خاموشی چھا گئی۔ کمال تحمل سے انتظار کرتا رہا بالآخر نازیہ توقیر نے ہا اٹھایا۔ وہ بہت پیاری لڑکی تھی۔ تین سال پہلے وہ فربہ اندام بچی تھی مگر اس عرصے اس کا مٹاپا چھٹ گیا تھا...... اور اب وہ بچی بھی نہیں تھی۔ بلکہ بہت حسین، نوخیز کا روپ دھار گئی تھی۔ وہ ذہین بھی تھی۔ ذہانت ایک ایسا وصف تھا جسے کمال خوبصور فوقیت دیتا آرہا تھا۔

"آپ وضاحت کریں......" وہ بولی۔

"میں نے جان بوجھ کر اس سوال میں ابہام چھوڑا تھا۔" کمال نے مسکراتے ہ کہا۔ "اس طرح اس سوال کا دائرہ زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔"

"میرے خیال میں بنیادی طور پر جنگ دو یا دو سے زیادہ فریقوں کے آپس لڑنے کا نام ہے۔" نازیہ نے جواب دیا۔

"جواب معقول ہے۔ اب کوئی مجھے جنگ کی وجوہات بھی بتائے۔"

علی نے بلند آواز میں کہا۔ "یہ رنگ کی بنیاد پر بھی ہوتا ہے۔ کالے گورو جھگڑے عام ہیں۔"

"اور زیادہ معقول وجوہات بھی ہیں۔" کمال نے کہا۔

"آپ کو میری بات کبھی معقول نہیں لگتی؟" علی نے شکایت کی۔

"یہ بات نہیں۔ امریکا میں رنگ کی بنیاد پر بدترین بلوے ہوئے ہیں لیکن لو

بنیادوں پر بھی تو ایک دوسرے کو ناپسند کرتے ہیں۔"

"اس کی بنیاد کوئی ایسی چیز بھی ہو سکتی ہے جس کی خواہش دونوں فریقوں کو ہو۔" نازیہ بولی۔

"اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے ذیشان؟"

ذیشان کھڑکی سے باہر کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل متوجہ نہیں تھا۔ گڑبڑا کر بولا۔ "کس بارے میں سر؟"

"ان طلباء کے بارے میں جن کی توجہ پڑھائی پر نہیں ہوتی۔"

"ان کے بارے میں میری رائے کچھ اچھی نہیں ہے سر۔" ذیشان نے جواب دیا۔

اس پر ساری کلاس میں قہقہے لگے۔

خاموشی ہوئی تو کمال نے پوچھا۔ "یہ بتاؤ، جنگ کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"لالچ بھی ہو سکتا ہے۔" ذیشان نے کہا۔ "مثلاً ملکوں کے درمیان سرحد پر بھی جنگ ہوتی ہے۔ کوئی ملک دوسرے ملک کے علاقے پر قابض ہونا چاہتا ہے۔"

"گڈ۔ یعنی زمین، دولت، وسائل والے علاقے...... یہ وہ چیزیں ہیں جن کے لئے دو فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو سکتی ہیں۔" کمال نے کہا۔ "اور اختلاف بھی ہوتے ہیں جو تنازعات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔"

عذرا نے ہاتھ اٹھایا۔ وہ بہت شرمیلی لڑکی تھی۔ "یہ بھی تو ہوتا ہے سر کہ کسی ملک کو اپنے توسیع پسند پڑوسی کی تھوپی ہوئی جارحیت کے خلاف اپنا دفاع کرنا پڑے۔"

"یہ بھی درست ہے۔ اکثر مدافعانہ جنگیں بھی لڑی جاتی ہیں۔" کمال نے تبصرہ کیا۔

"نظریاتی اور عقائد کا اختلاف بھی جنگوں کا سبب ہوتا ہے۔" یہ رئیس کی آواز تھی۔

"ہاں، ہوتا ہے۔ اس کے لئے صلیبی جنگوں کی مثال دی جا سکتی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہارے ذہن میں یہ نہیں تھا۔ تمہارا دھیان جنگ بدر اور احد کی طرف بھی نہیں گیا ہوگا۔ اس لئے مجھے یہ بتاؤ کہ تم اس کے لئے کیا مثال دو گے؟"

"سرمایہ داروں اور کیمونسٹوں کی جنگ کی۔" رئیس نے کہا۔ "اور یہ بھی

ضروری نہیں کہ جنگ دو قوموں کے درمیان ہی ہو۔ جنگ مختلف اور متصادم آئیڈیالوجی رکھنے والے دو گروہوں کے درمیان بھی ہوتی ہے۔ جیسے شمالی اور جنوبی ویت نام.........."

"یا جیسے کفر و ایمان کی جنگ۔" کمال نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایمان فتح یاب ہوا ورنہ آج دنیا میں صاحب ایمان لوگ موجود نہ ہوتے۔"

"ہم میں سے چند کی خوش قسمتی ہے کہ ویت نام میں بہتر آئیڈیالوجی والوں نے جنگ جیتی۔" رئیس نے کمال کی سنی ان سنی کر کے کہا۔ "اس لئے کہ وہاں سرمایہ داری کو شکست ہوئی۔"

"تم جس معاشرے میں رہتے ہو رئیس' وہاں کمیونزم کی کوئی گنجائش نہیں.........."

"میں جانتا ہوں۔ یہاں نام اسلام کا چلتا ہے مگر حکومت سرمایہ داری کی ہے۔" رئیس نے کہا۔ "یہاں امریکہ کے آشیرواد کے بغیر حکومتیں نہیں چلتیں۔"

"یہ کمیونسٹ معاشرہ ہوتا تو تمہیں اتنا بولنے کی اجازت بھی نہ ہوتی۔" کمال کا لہجہ زہریلا ہوگیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ رئیس کا باپ اسی امریکا نواز حکومت کا وزیر داخلہ ہے لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔ وہ ڈرتا نہیں تھا لیکن اس کے خیال میں اخلاقاً یہ رکیک حملہ ہوتا۔

"آپ تو اب بھی نہیں چاہتے کہ میں بولوں۔"

"نہیں۔ میں تم سے بولنے کا حق نہیں چھینوں گا۔"

"آپ کو اس کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ حق تو ہمارا معاشرہ اور حکومت پہلے ہی چھین چکے ہیں۔ یہ طے کرلیا گیا کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ تبادلہ خیال کی.......... اختلاف کرنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی ہے۔ گھر میں ہر بات پر کہا جاتا ہے.......... ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹے۔"

"اب گھر کا تو میں کچھ بھی نہیں کرسکتا۔" کمال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں بہرحال کلاس میں طلباء کو تہذیب کے دائرہ میں رہتے ہوئے اختلاف کا حق دیتا ہوں لیکن

یاد رکھو' ہر معاشرہ اپنے تشخص کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے اپنی بقا کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں افراد پر کچھ پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔"

"ہاں۔ معاشرہ جھوٹ اور کرپشن کے سہارے شخصی آزادی کو غصب کر کے اپنی بقاء کا اہتمام کرتا ہے۔" رئیس نے تند لہجے میں کہا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں شخصی آزادی کا حوالہ دینے کا حق حاصل ہے۔" کمال نے نرم لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "اس لئے کہ آنجہانی روس کی اور تمام کمیونسٹ ممالک کی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ وہاں شخصی آزادی کا تصور ہی نہیں تھا۔"

"میں اپنے معاشرے کی بات کر رہا ہوں۔"

"معاشرہ افراد سے بنتا ہے اور کوئی انسان خامیوں سے مبرا نہیں۔ لہٰذا معاشرہ بھی خرابیوں سے پاک نہیں ہوتا۔ افراد اپنی اصلاح کرلیں تو معاشرہ برائیوں سے پاک ہوجائے گا۔ اب بولو' میں اپنی بات آگے بڑھاؤں؟"

"میں آپ کو روک تو نہیں سکتا۔"

کمال اس بحث کو جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن پھر اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔

"بہت سے عظیم مصنفوں نے اپنے جنگ کے تجربات کو ادب میں پیش کیا ہے۔" اس نے کہا۔ "ان کی بڑی اہمیت ہے۔ ہم ان کے حوالوں سے انسانی رویوں کی اسٹڈی میں مدد حاصل کرتے ہیں۔"

"لیکن مغرب کے حوالے میں ہی.........." رئیس نے پھر مداخلت کی۔

"دکھوں' تکلیفوں اور مصائب پر انسانی ردعمل کو مشرق اور مغرب میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ آنسو مغرب میں مشرق سے مختلف نہیں ہوتے اور تمہیں جنگ کا تجربہ نہیں ہے اس لئے تمہیں دوسروں کے حوالوں سے سیکھنا اور سمجھنا ہوگا۔"

"یہ بات آپ میرے اور سب کے لئے نہیں' صرف اپنے لئے کہیں۔"

"تمہیں اپنی رائے قائم کرنے کا حق ہے۔"

"کاش آپ کبھی مجھے اس کے اظہار کا موقع بھی دیں۔"

کمال نے اس بار اسے نظرانداز کردیا۔ "میں اب جو کچھ کہنے والا ہوں' میرا خیال

ہے اس سے کوئی اختلاف نہیں کر سکے گا۔" اس نے کہا۔ "اپنی ضرورتوں کے تحت صدیوں سے ایک دوسرے سے نبرد آزما قومیں اب مفاہمت کے ذریعے اپنے اختلافات طے کر رہی ہیں۔ وہ ایک مشترکہ مفاد کے تحت ایک دوسرے سے تعاون کر رہی ہیں۔ وہ مشترکہ مفاد ہے بقا۔ جیو اور جینے دو۔ اس لئے کہ اب جنگ دنیا کو فنا کے غار میں دھکیل سکتی ہے اور مشترکہ مفاد ہے ایک دوسرے سے تجارت اور اپنی اپنی خوش حالی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جنگ کے خطرات کم ہوتے جا رہے ہیں۔ امن کے امکانات روشن ہوتے جا رہے ہیں۔"

"لیکن نظریاتی اختلافات پر سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔" رئیس نے کہا۔

"ہر چیز پر سمجھوتا ممکن ہے۔" کمال بولا۔ "اب امریکا اور روس کو ہی دیکھ لو............"

"سب دکھاوا ہے۔ آخر میں دیکھئے گا............"

"یہی رویہ تو جنگ کی طرف لے جاتا ہے۔"

"اور سمجھوتے معاشرے کو اخلاقی اعتبار سے کمزور کر دیتے ہیں۔"

"تم اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کرتے ہو۔"

"یہ بات آپ اس لئے کہہ رہے ہیں کہ آپ یہ باتیں نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی ذاتی طور پر تو آپ جنگ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔"

کمال ہچکچایا۔ اسے اس موضوع کی طرف گھسیٹا جا رہا تھا جس پر وہ بات کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ چپ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ "میں ایک جنگ لڑ چکا ہوں اور جنگ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔"

"ہاں۔ ۷۱ء میں شاید آپ فوج میں کلرکی کر رہے ہوں گے۔"

اب پیچھے ہٹنا کمال کے لئے ناممکن تھا۔ پوری کلاس کا تجسس بھڑک اٹھا تھا۔

"نہیں۔ میں نے عملی طور پر جنگ میں حصہ لیا تھا۔" اس نے کہا۔

"آپ نے دشمن کے کسی فوجی کو مارا بھی تھا؟" یہ سوال نازیہ نے کیا تھا۔

"میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کس طرح کے فوجی تھے۔" رئیس نے حقارت سے کہا۔

"میں نے موت اور تباہی و بربادی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔" کمال کا لہجہ مدافعانہ ہو گیا۔ "اور جنگ میں لوگ ایک دوسرے کو مارتے ہیں لیکن کسی کاز کے لئے۔ اس میں ذاتیات کا دخل نہیں ہوتا۔ میں وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔"

"آپ لوگوں نے مشرقی پاکستان ہار دیا............" رئیس نے جارحانہ انداز میں کہا۔

"وہ فوج کا نہیں، اقتدار کے بھوکے سیاستدانوں اور ایک جنرل کا کیا دھرا تھا۔ فوج تو خواہ مخواہ رسوا ہوئی۔" کمال نے تند لہجے میں کہا۔

"تب تو آپ جنگی قیدی بھی رہے ہوں گے؟"

"ہاں۔ لیکن میں اس پر بات نہیں کرنا چاہتا............"

"ظاہر ہے۔ وہ تو آپ کی بزدلی کا ثبوت ہوا نا............"

کمال کا جی چاہا کہ اس پر برس پڑے، اسے بے نقط سنا ڈالے۔ وہ حد سے گزر گیا تھا لیکن اس نے جیسے تیسے خود کو قابو میں رکھا۔ "تم لوگ کتابیں کھولو اور پڑھنا شروع کر دو۔ مجھے اور رئیس کو باہر ہال میں جا کر کچھ تبادلہ خیال کرنا ہے۔"

وہ اور رئیس دروازہ بند کر کے باہر نکل آئے۔ کمال دروازے سے قریب ہی رہا تاکہ کلاس کی آوازیں بھی سن سکے۔ "دیکھو رئیس! ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "تم جانتے ہو کہ مجھے معقولیت سے بحث کرنا اچھا لگتا ہے لیکن نامعقولیت مجھے پسند نہیں۔ تم مجھے بتاؤ، تمہارا مسئلہ کیا ہے؟"

"مجھے بچوں کی طرح پڑھایا جانا پسند نہیں۔ آپ ہمیں دنیا کی تصویر اپنی آنکھوں سے دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری بات سنی نہیں جاتی۔"

کمال مسکرا دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تم نے یہ تاثر لیا لیکن میں تمہیں دنیا کی تصویر دوسرے بڑے لوگوں، بڑے مصنفوں کی آنکھوں سے دکھانے کی کوشش کرتا ہوں اور حوالے بھی دیتا ہوں۔ میں نے کبھی اپنے نظریات تم پر نہیں تھوپے۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو ممکن ہے ایسا ہو لیکن غیر ارادی طور پر ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا ہے تو میں معذرت خواہ

ہوں۔"

"آج آپ معذرت کریں گے اور کل پھر یہی کریں گے۔"

کمال سناٹے میں آگیا۔ یہ مغرب کے طرز تعلیم کی خرابیوں میں سے ایک تھی۔ کوئی عام اسکول ہوتا تو یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو کچھ اساتذہ طلباء سے کہتے تھے' یہاں ایک طالب علم اپنے استاد سے کہہ رہا تھا۔ یہاں طلباء کو خوداعتمادی دی جاتی تھی۔ یہ نہیں سوچا جاتا تھا کہ خوداعتمادی اور بدتمیزی کے درمیان حد فاصل بھی مقرر ہونی چاہئے۔ بہرحال اس نے بڑے تحمل سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ایسا ہوا تو تم مجھے یاد دلا دو گے۔ اب ہمارے درمیان جنگ بندی ہو جانی چاہئے تاکہ دوسرے طلباء کی پڑھائی کا نقصان نہ ہو۔"

رئیس کو اپنے ٹیچر کی نرمی کے ہاتھوں شکست کا احساس ہو رہا تھا اور شکست اسے قبول نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ "آپ مجھے ناپسند اس لئے کرتے ہیں کہ میں آپ کی یک طرفہ گفتگو میں مداخلت کرتا ہوں۔"

"یہ تمہارا نقطہ نظر ہے۔ اب تم اپنے بارے میں میری رائے بھی سن لو۔" کمال نے کہا۔ "بنیادی طور پر تم اچھے لڑکے ہو لیکن تم اس کو چھپانے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہو۔ تم بال بڑھاتے ہو' میلے کپڑے پہنتے ہو اور تم ذہین ہو۔ بلکہ شاید تم میری کلاس کے ذہین ترین طلباء میں سے ہو لیکن تم دوسروں پر اپنی اصل شخصیت ظاہر کرنے سے ڈرتے ہو۔ مگر تمہیں دوسروں کی توجہ چاہئے۔ اس کے لئے تم کپڑوں سے بے پروائی کرتے ہو۔ کلاس میں تندو تیز بحث کرتے ہو۔ رئیس.......... ہم جانتے ہیں کہ تم زندہ انسان ہو۔ دوسروں کو خود کو پسند کرنے کا موقع بھی دو۔"

رئیس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ وہ ہکلانے لگا۔ "آپ نے.......... میری کوئی بات.......... نہیں سنی۔ سب ٹیچر ایک.......... جیسے ہوتے ہیں۔" اس سے اور کچھ نہیں کہا گیا۔ وہ تیز قدموں سے زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ کمال اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اس نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔ اس نے رئیس کو آئینہ دکھا دیا تھا۔ اب وہ حقیقت تسلیم کرے نہ کرے۔ وہ جانے۔

وہ پلٹا اور دروازہ کھول کر کلاس روم میں چلا گیا۔

☆-----------☆-----------☆

بابر فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں اسلحے کا ڈھیر جمع کئے بیٹھا تھا۔ سب لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ "میں اب تم لوگوں میں اسلحہ تقسیم کروں گا۔" اس نے کہا۔ "تم میں سے ہر ایک کے پاس ایک رائفل اور ایک ہینڈ گن ہو گی۔ انہیں ہر وقت اپنے پاس رکھنا۔ ہر گن لوڈ ہے اور سیفٹی کیچ ہٹا ہوا ہے۔ اسے ہٹا ہی رہنے دینا۔ میرے پاس تم لوگوں کے لئے ایمونیشن بیلٹس بھی ہیں۔ میرے اور مشکور کے پاس شاٹ گنیں ہوں گی۔ تم لوگوں کو رائفلوں کے لئے دو فاضل کلپ ملیں گے۔ میں نے اتنی مشق کرا دی ہے کہ یقین ہے' کلپ تبدیل کرنے میں تم لوگوں سے غلطی نہیں ہو گی۔ اس کے علاوہ تم میں سے ہر ایک کو تین دستی بم دیئے جائیں گے۔" اس نے فرش پر رکھے ہوئے صندوق میں ہاتھ ڈالا اور ایک دستی بم نکالا۔ "یہ تمہاری ایمونیشن بیلٹ سے کلپ ہوں گے۔ ان کا استعمال بھی تمہیں آتا ہے۔ رِنگ کھینچو گے تو بم تیار۔ بس پھر ہینڈل ریلیز کرنا اور انہیں اچھال دینا ہو گا۔ اس کے لئے تمہارے پاس دس سیکنڈ کی مہلت ہو گی۔ بم پھینک کر خود زمین پر لیٹ جانا۔ کسی کو کچھ پوچھنا ہے؟"

شہلا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "ہمیں ان چیزوں کو استعمال کب کرنا ہو گا؟"

"یہ تمہیں معلوم ہو جائے گا جب کوئی اور چارہ نہ رہے تب یہ کام آئیں گے۔" بابر نے کہا اور اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "اب ہماری روانگی میں ایک گھنٹہ ہے۔ یہاں سے ہر سراغ مٹا کر نکلنا ہے۔ یہاں ہمیں کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑنی جس سے پولیس کو مدد مل سکے۔ جو کچھ جلایا جا سکتا ہے اسے جلا ڈالو۔ کپڑوں سے لیبل ہٹا دو۔ کوئی سراغ نہیں چھوڑنا ہے.........."

وہ پندرہ منٹ تک بولتا رہا۔ اس کی آواز ہر گزرتے لمحے کے ساتھ پُرجوش ہوتی گئی۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ نذیر نے خود کو ٹٹولا لیکن اس کے اندر کوئی جذبہ نہیں تھا۔ بابر بولے جا رہا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ یہ محض آغاز ہے۔ اس کے پاس مختلف جیلوں میں موجود سزا کاٹنے والے پچاس مجرموں کے نام ہیں۔ اس پہلی کامیابی کے بعد یہ تمام مل کر درجنوں یونٹ بنائیں گے۔ ایک سال کے اندر اندر وہ کسی حکومت کی طرح منظم اور

مستحکم ہوجائیں گے۔ کراچی سے پشاور تک یونٹوں کا جال بچھ جائے گا۔ یونٹ ایک جگہ کارروائی کرکے دوسری جگہ پہنچ جائیں گے۔ کارروائیوں کا لامتناہی سلسلہ ہوگا اور دولت کا انبار ہوگا۔ ملک کے خزانے میں اتنی دولت نہیں ہوگی جتنی اس تنظیم کے پاس ہوگی۔ ان کی ٹیکنک ہوگی۔ ہٹ اینڈ موو۔ وار کرو اور نودو گیارہ ہوجاؤ۔ یہ یونٹ بس چار پانچ کارروائیاں کرے گا۔ پھر اس کے اراکین کی حیثیت ملکی کابینہ کی سی ہوگی۔ پھر وہ ملک سے باہر بھی یونٹ بنائیں گے۔ اپنا دائرہ وسیع کریں گے.......... اور بالآخر پوری دنیا پر چھا جائیں گے..........

نذیر کو بابر کی آنکھوں میں جانی پہچانی چمک نظر آئی۔ جیسے وہ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ ہوتے دیکھ رہا ہو مگر اس بار نذیر نے بابر کی گفتگو سے ہپناٹائز ہونے سے انکار کردیا۔ اس نے اس کے لفظوں کو نظرانداز کردیا اور اپنی توجہ اس کے چہرے اور آنکھوں پر مرکوز کردی۔ وہ خاص طور پر اس کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان میں چمک تھی لیکن ریاکاری بھی تھی۔ وہ پہلا موقع نہیں تھا کہ نذیر کو بابر کی سچائی اور خلوص پر شبہ ہوا ہو۔ کبھی کوئی اتفاقی نظر یا لہجے میں آنے والی تبدیلی لفظوں سے کہیں بڑھ کر کچھ بتا دیتی ہے۔ بابر جب کسی کو اذیت سے دوچار کرنے والا ہوتا تھا یا کسی اور کو ایسا کوئی کام تفویض کرتا تھا تو اس کی خوشی دیدنی ہوتی تھی اور اس وقت وہ غیر محتاط بھی ہوجاتا تھا۔ نذیر جانتا تھا کہ بابر گھٹیا اور بے رحم آدمی ہے.......... اور یہی نہیں، وہ اپنے گھٹیا پن اور بے رحمی سے خوشی بھی حاصل کرتا ہے۔

وہ فلیٹ سے سب کچھ صاف کرکے نکلے۔ نذیر نے یونٹ کو اتنا طاقتور کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے ایمونیشن بیلٹس باندھی ہوئی تھیں اور بیلٹ سے دستی بم یوں لٹک رہے تھے جیسے درخت کی شاخ پر پکے ہوئے پھل۔ بابر اور مشکور کی شاٹ گنیں ان کی گود میں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ سب ایک جیسے لباس میں تھے۔ جینز، خاکی شرٹس اور پیراشوٹ جیکٹس۔ سروں پر موزوں کی ٹوپیاں اور بڑے دھوپ کے چشمے بابر کا اختراعی اضافہ تھے۔ نذیر نے حیرت سے دیکھا۔ اب وہ سب بالکل ایک سے لگ رہے تھے۔ کسی کی کوئی شناخت نہیں رہی تھی۔ بس فرق تھا تو صرف قدوقامت اور جسامت کا۔ نذیر کو تحفظ کا

بھرپور احساس ہونے لگا۔

وہ سب چرائی ہوئی اسٹیشن ویگن میں تھے۔ کار وہ راولپنڈی میں ہی چھوڑ آئے تھے۔

☆============☆============☆

آہٹ محسوس کرکے کمال نے لیکچر دیتے دیتے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دروازے میں ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی جس کا رخ اس کے پیٹ کی طرف تھا۔ اس کا پہلا ردعمل حیرت کا تھا۔ پھر اس نے سوچا، کہیں یہ رئیس سے گزشتہ روز کی گفتگو کا نتیجہ تو نہیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ مذاق ہے لیکن اسے کسی نتیجے پر پہنچنے کا موقع نہ مل سکا۔

"مسٹر کمال، اگر آپ اپنی کرسی پر جا بیٹھیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ ہم کچھ عرصے کے لئے آپ کی کلاس روم مستعار لے رہے ہیں۔ بدقسمتی سے آپ اور آپ کے طلباء کلاس روم میں شامل ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب پُرسکون اور خاموش رہیں۔ خاموش بیٹھنے کے سوا آپ کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ ہم آپ سے تہذیب اور تعاون کے متمنی ہیں لیکن آپ کی طرف سے مزاحمت یا کوئی متشددانہ کارروائی ہوئی تو آپ اس کے لئے ہمیں تیار پائیں گے۔ اب آپ تشریف رکھئے۔"

کمال کو وہ سب عجیب سا لگ رہا تھا۔ تاہم وہ بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ پوری کلاس پر سکتہ طاری ہے۔ شاٹ گن نے انہیں دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کا ہنسنے کو جی چاہا لیکن اس وقت تک اسے صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوچکا تھا۔ وہ سب کچھ مذاق نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کوئی ڈراؤنا خواب تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ کسی اعتبار سے بھی حقیقت نہیں لگتا تھا۔ اس مداخلت کار کے چہرے پر واحد قابل شناخت نقوش اس کے پتلے پتلے ہونٹ تھے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

اسی وقت آگ کے خطرے والا الارم چلانے لگا۔ کمال بری طرح چونکا۔

"آپ سب بیٹھے رہیں۔" شاٹ گن بردار نے کہا۔ "یہ الارم آپ کے لئے نہیں ہے۔"

☆-----------☆-----------☆

نذیر نے آگ کے خطرے والا الارم کھینچا اور منتظر رہا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہوگیا ہے۔ وہ وین کو اسکول کے مشرقی دروازے سے لے کر احاطے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اپنا تمام سامان اور خوراک کا ذخیرہ نیچے اتارا۔ پھر مشکور تیسری منزل پر جانے کے لئے زینوں کی طرف چل دیا۔ نذیر نے وین پارک کردی۔ مشکور نے آکر اطلاع دی کہ میدان صاف ہے تو وہ چاروں سامان اٹھاکر تیسری منزل کے فیکلٹی روم کی طرف چل دیئے جو سنسان پڑا تھا۔ فیکلٹی روم پر قبضہ کرتے ہی بابر کوریڈور میں نکلا اور آخری کلاس روم میں داخل ہوگیا۔ سب کچھ منصوبے کے مطابق ہوا تھا۔

بابر کے جانے کے دو منٹ بعد نذیر نے سر باہر نکال کر جائزہ لیا اور پھر قریبی فائر الارم کا لیور کھینچ دیا۔ پھر وہ تماشا دیکھتا رہا۔ کلاسوں سے گھبرائے ہوئے طلباء اور ٹیچر نکلے اور زینوں پر ہنگامہ برپا ہوگیا۔ سب بیک وقت باہر نکلنا چاہ رہے تھے۔ اس معاملے میں بھی بابر کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ چند منٹ کے اندر کلاسوں کی روشنیاں بجھ گئیں اور تمام طلباء باہر نکل گئے۔ جیسے ہی وہ منزل خالی ہوئی نذیر نے باہر نکل کر چیک کیا کہ تمام کلاسیں خالی ہو چکی ہیں یا نہیں۔ پھر واپس آکر اس نے رپورٹ دی۔

"اب ایک ایک بیگ لو اور اسے ہر زینے پر تین سیڑھیاں نیچے رکھ دو۔" نذیر نے ہدایت دی۔ یہ ہدایت اسے بابر سے ملی تھی۔ "بیگ رکھنے کے بعد چیک کرلینا کہ ریڈیو آن ہے یا نہیں۔ ریڈیو آن ہونا چاہئے۔ یہ کہہ کر وہ خود درمیانی زینوں کی طرف چل دیا۔ بم کا بیگ چوتھی سیڑھی پر رکھتے ہوئے اسے قریب ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو ایک نوجوان عورت کو سامنے کھڑا پایا۔ "کیا بات ہے؟ کیا چاہتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں کمال کو لینے کے لئے واپس آئی ہوں۔" عورت بولی۔

نذیر ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس نے عورت پر رائفل تان لی۔ "کون کمال؟"

"کمرہ نمبر ۱۲ کا ٹیچر۔"

"وہ تو نیچے نہیں آسکتا لیکن میرا خیال ہے، تم اوپر آجاؤ۔"

صوفیہ پیچھے ہٹنے لگی۔ "نہیں.........."

"سنو۔ مجھے مجبور نہ کرو۔ میں تم پر گولی نہیں چلانا چاہتا۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ تم یہاں کیا کررہے ہو مگر مجھے اس میں ملوث مت کرو۔"

"بہتر یہی ہے کہ اوپر آجاؤ۔ تم نہ چاہتے ہوئے بھی ملوث ہو چکی ہو۔"

"مجھے جانے دو.........."

"اب تم اوپر آجاؤ محترمہ۔ ورنہ میرے ہاتھوں ضائع ہوجاؤ گی۔"

صوفیہ پلٹی اور سیڑھیوں پر نیچے کی طرف بھاگی۔ اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ گولیاں اس کے سر کو چھوتی ہوئی گزری ہیں۔ وہ خوف سے اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ نذیر نے آکر اسے بازو سے تھاما اور گھسیٹتا ہوا اوپر لے چلا۔ اب صوفیہ میں مزاحمت کی طاقت نہیں تھی۔ اوپر پہنچ کر اس نے شہلا کو پکارا۔ "شہلا' یہاں آؤ۔ اسے کلاس میں لے جاؤ اور دوسروں کے ساتھ جمع کرادو۔"

شہلا فیکلٹی روم سے نکلی۔ اس نے رائفل سے صوفیہ کو کور کرلیا۔ "اسے کیوں دھرلیا ہے تم نے؟" اس نے پوچھا۔

"میری مرضی۔ بس اسے لے جاؤ۔" نذیر نے کہا اور صوفیہ کو شہلا کی طرف دھکیل دیا۔

شہلا صوفیہ کو لے کر آخری کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔ نذیر فیکلٹی روم میں چلا گیا۔ مشکور اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اسے فائرنگ کی آوازوں سے تشویش ہوئی تھی۔

"مشکور.......... یہ زنجیر لے جاؤ اور بم کے بیگ کو اس طرف کونے والے زینے کی ریلنگ سے باندھ دو۔" نذیر نے کہا۔ "ذرا ڈھنگ سے باندھنا۔ یہ نہ ہو کہ کوئی آئے اور بیگ کھول کر چلتا بنے۔"

☆-----------☆-----------☆

پرنسپل جمیل الرحمن نے اپنے کمرے میں فائر الارم کی آواز سنی تو وہ چونک کر اٹھا۔ اس نے سوچا' پھر کسی بچے نے شرارت کر ڈالی ہے۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ کوئی الارم بجادیتا اور کلاسیں باہر گراؤنڈ میں پہنچ جاتیں۔ اس کے تدارک کی کوئی تدبیر اسے آج تک

نہیں سوجھی تھی۔ وہ بیرونی آفس میں آیا تو شیشے کی دیوار سے اسے پندرہ سو طلباء کا ہجوم نظر آیا۔ "میں آل کلیئر کا الارم بجادوں؟" سکریٹری مسز جعفری نے اس سے پوچھا۔

"رہنے دو۔ میں جاکر الارم چیک کروں گا اور اسے آف کردوں گا۔" جمیل الرحمٰن نے کہا۔

وہ باہر کاریڈور میں نکل آیا اور الارم چیک کئے۔ مخالف سمت سے اسے پی ٹی آئی مظفر خان آتا نظر آیا۔ "طلباء تو سب نکل آئے ہیں۔" مظفر خان نے کہا "تیسری منزل کا الارم ہوگا۔ کیوں کہ ستار صاحب نے باہر آتے ہوئے دوسری منزل کے تمام الارم چیک کرلئے تھے۔"

وہ دونوں کونے والے زینوں کی طرف چل دیئے۔ "آج دن کا آغاز بہت اچھا ہوا تھا۔" جمیل الرحمٰن نے کہا۔ "ہر طرف سکون تھا۔ کلاسوں میں حاضری بہت اچھی تھی۔ پارکنگ لاٹ میں چھپ کر سگریٹ پیتا ہوا بھی کوئی نظر نہیں آیا مگر مجھے یقین تھا کہ یہ سکون قائم رہنے والا نہیں۔" وہ تیسری منزل کی لینڈنگ سے مڑے۔ جمیل الرحمٰن کے منہ سے نکلا۔ "خدا کی پناہ!" شکور کی شاٹ گن اس کے چہرے سے بمشکل چند انچ دور تھی۔

"رک جاؤ.......... اور واپس چلے جاؤ۔" مشکور غرایا۔ "ورنہ تمہارا بھیجا اڑا دوں گا۔"

"یہ ہو کیا رہا ہے؟" مظفر خان تیزی سے آگے بڑھا۔

"پیچھے ہٹو۔"

جمیل الرحمٰن کے لئے اتنا کافی تھا۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ کوئی سنگین نوعیت کی گڑبڑ ہے اور وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتے۔ بے بس ہیں۔ وہ پیچھے ہٹنے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیا چکر ہے لیکن میں پیچھے ہٹنے والا نہیں۔" مظفر خان نے کہا اور سیڑھیاں چڑھ کر مشکور کی طرف بڑھنے لگا۔

"ٹھہرو۔" جمیل الرحمٰن نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روکنے کی کوشش کی لیکن مظفر خان نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑالیا۔ وہ صرف تین سیڑھیاں چڑھا تھا کہ کان پھاڑ د

والا دھماکا ہوا اور وہ نیچے لینڈنگ پر آگرا۔ جمیل الرحمٰن پہلے ہی پلٹ کر شاٹ گن کی رینج سے دور سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ وہ تیسری منزل سے پلٹا ہی تھا کہ اس کے سر کے اوپر دیوار سے گولیاں ٹکرائیں۔ دیوار سے پلاسٹر ادھڑا اور اس کے چہرے سے ٹکرایا۔

وہ اپنے آفس میں داخل ہوا تب بھی بھاگ رہا تھا۔ "پولیس کا فون نمبر ملاؤ۔" اس نے ہانپتے ہوئے مسز جعفری سے کہا۔

مسز جعفری نے دہشت بھری نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ "ارے.......... آپ تو خون خون ہورہے ہیں۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم نمبر ملاؤ۔" جمیل الرحمٰن نے دیوار سے ٹیک لگا کر اپنے جسم کے لرزے پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن خوف کی ایک لہر نے اس کی کوشش کو ناکام بنادیا۔ مسز جعفری نے ریسیور اس کی طرف بڑھایا۔ اس وقت تک بھی وہ خود پر قابو نہیں پاسکا تھا۔

"میں پائن ووڈ کانونٹ اسکول کا پرنسپل بول رہا ہوں۔ جمیل الرحمٰن۔" اس نے لرزیدہ آواز سے کہا۔ "یہاں اسکول میں ایمرجنسی صورت حال ہے۔ عمارت کی تیسری منزل پر ایک مسلح آدمی موجود ہے۔ وہ ہمارے ایک ٹیچر کو پہلے ہی شوٹ کرچکا ہے۔ جلدی کریں.......... پلیز.......... کچھ کریں۔"

☆============☆============☆

مشکور کے دوسرے فائر سے پہلے ہی بابر کمرے سے نکل چکا تھا۔ فائر نذیر نے بھی کیا تھا لیکن بابر کو تشویش نہیں ہوئی تھی۔ نذیر سمجھ دار آدمی تھا لیکن مشکور کی شاٹ گن کی گرج نے اسے وحشت میں مبتلا کردیا۔ وہ جانتا تھا کہ مشکور کچھ بھی کرسکتا ہے۔ مشکور کو تو خون بہا کر خوشی ہوتی ہے۔ وہ زینوں پر پہنچا تو اس کے اندیشے کی تصدیق ہوگئی۔ لینڈنگ پر جو شخص پڑا تھا' اس کے سینے میں ایک چھوٹی کھڑکی جتنا مہیب خلا نظر آرہا تھا۔ اس میں شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ مرچکا ہے۔ "کیا ہوا؟" اس نے مشکور سے پوچھا۔

"یہ مجھ سے ہاتھا پائی کررہا تھا۔ شاٹ گن چھیننا چاہ رہا تھا۔ میں نے اسے شہ

کر دیا۔" مشکور نے وضاحت کی۔

"اور دوسرا فائر؟"

"اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ وہ بچ نکلا۔" مشکور نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

بابر تیزی سے پلٹا اور فیکلٹی روم کی طرف چل دیا۔ فیکلٹی روم پہنچ کر اس نے انٹر کام اٹھایا اور بزر دیا۔ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز ابھری۔ "اپنے پرنسپل سے بات کراؤ۔" پھر وہ انتظار کرتا رہا۔ مردانہ آواز سنتے ہی اس نے درشت لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں تنبیہہ کر رہا ہوں۔ پولیس کو تیسری منزل سے دور ہی رکھنا۔ ورنہ یہ خون میں نہا جائے گی۔ تمہارے دو ٹیچر اور طلباء کی ایک پوری کلاس ہمارے قبضے میں ہے۔ ذرا سی بھی گڑبڑ ہوئی تو ان کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکے گی۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ہم کس قدر منظم ہیں اور ہماری پوزیشن کتنی مضبوط ہے۔"

ریسیور رکھنے کے بعد وہ باہر نکلا۔ شہلا اور نذیر راہداری میں موجود تھے۔ نذیر نے کہا۔ "میرا تو خیال تھا کہ خون خرابہ ذرا بھی نہیں ہوگا۔"

"ہم یہاں کرکٹ کھیلنے نہیں آئے ہیں۔ صورت حال ہمارے اندازے سے مختلف ہوگی تو خون بھی بہے گا۔" بابر نے تند لہجے میں کہا "تم اس لاش کو لے جا کر دوسری منزل پر ڈال دو۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمارے اپنے پتے میز پر پھیلانے سے پہلے ہی اسکول پولیس والوں سے بھر جائے گا اور ہاں.......... ذرا مجھے ریڈیو دو۔"

شہلا ریڈیو لینے چلی گئی۔ بابر اور نذیر ٹہلتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ وہ لاش کو گھسیٹتے ہوئے دوسری منزل پر لے گئے۔ لاش اپنے پیچھے ایک پگڈنڈی بناتی گئی۔ وہ واپس آئے تو شہلا ہاتھ میں ریڈیو لئے کھڑی تھی۔ بابر نے اس سے ریڈیو لیا اور بٹن دبایا۔

"ہیلو شہناز.......... میری آواز سن رہی ہو؟"

☆==========☆==========☆

شہناز اپارٹمنٹ کی کھڑکی میں کھڑی سڑک پار اسکول کے میدان کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ وہاں کی نقل و حرکت سے صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ طلباء ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ ٹیچرز ایک ٹولی بنائے کھڑے تھے۔ اسکول کی عمارت سے

کوئی نکل کر آیا اور اس نے ٹیچروں سے کچھ کہا اور واپس چلا گیا۔ ایسا کئی بار ہوا۔ شاید ٹیچروں کے لئے ہدایات آ رہی تھیں پھر شہناز کو ایسا لگا کہ اس نے فائر کی آواز سنی ہے۔ اس کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ وہاں موجود نہیں ہے۔ بابر کی کال نے اسے بری طرح چونکا دیا "ہاں.......... میں سن رہی ہوں۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"پولیس یہاں پہنچنے والی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ ہم پر دھاوا بول دیں گے۔ مجھے باخبر رکھنا۔"

"تم فکر نہ کرو۔ یہ بتاؤ' وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"مشکور نے ایک ٹیچر کو ختم کر دیا ہے۔ وہ ہیرو بننے کی کوشش کر رہا تھا۔" بابر نے بتایا۔ "باقی سب خیریت ہے۔"

"شہلا کا کیا حال ہے؟"

"فرسٹ کلاس۔ اب وہ بہادر ثابت ہو رہی ہے۔" بابر نے جواب دیا اور دل ہی دل میں کہا۔ اب اداکاری کی ضرورت جو نہیں رہی۔ "اور سنو شہناز' تم خاص طور پر چھت پر نظر رکھنا۔ ان کے پاس ہم تک پہنچنے کا وہی ایک راستہ ہے۔"

"ٹھیک ہے بابر۔"

رابطہ منقطع کر کے بابر باہر نکلا اور اس نے تینوں زینوں سے بندھے ہوئے چارجز کو اچھی طرح چیک کیا۔ اب وہ گھبرا رہا تھا۔ اگر سو ڈیڑھ سو پولیس والوں نے دھاوا بول دیا تو ڈائنامائٹ کے تین چارجز اور چند گنیں انہیں نہیں روک سکیں گی۔ "شہلا' تم کلاس روم میں چلی جاؤ اور مشکور کو یہاں بھیج دو۔" اس نے کہا۔ وہ مشکور کے آنے تک مضطربانہ انداز میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا پھر وہ مشکور سے بولا۔ "ہم تینوں کو تینوں زینوں پر نظر رکھنی ہے۔ جھکے رہنا اور کھڑکی سے دور رہنا۔ اگر انہوں نے اوپر آنے کی کوشش کی تو میں چارجز اڑا دوں گا۔ ایسے میں تم بموں سے دور ہی رہنا۔" اس نے مشکور اور نذیر کو گھور کر دیکھا۔ "میں درمیانی سیڑھیاں سنبھالوں گا۔ تاکہ فیکلٹی روم اور فون کے قریب رہوں۔ بس اب جاؤ۔"

☆==========☆==========☆

کمال سناٹے کے سے عالم میں اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ اس کے تمام طلباء بھی خاموش تھے۔ یوں بت بنے بیٹھے تھے' جیسے ابد کا حصہ بن گئے ہوں۔ کمال اٹھنا...... صوفیہ کے پاس جانا چاہتا تھا' جو کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی لیکن وہ خواہش اور کوشش کے باوجود نہ ہل سکا۔ دروازے کے باہر ایک ہیولا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ کمال کو یقین تھا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ رائفل کی بظاہر کوئی اوقات نہیں تھی۔ وہ انسان کا بنایا ہوا ہتھیار تھی اور اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتی تھی لیکن کمال اس کی ہلاکت خیزی سے آگاہ تھا۔ اس بھری پری کلاس کے لئے اجنبی ہاتھوں میں اس رائفل کی موجودگی مہلک تھی۔ اسی لئے وقت ٹھہر گیا تھا...... ساکت ہوگیا تھا! کمال کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ چاہے صرف کھڑا ہوجائے' لیکن وہ اس کے بس میں نہیں تھا۔

صوفیہ اچانک پلٹی اور اس کی میز کی طرف آئی۔ اسی لمحے باہر کھڑی عورت بھی اندر چلی آئی۔ صوفیہ نے اس سے کہا۔ "ہمیں بتاؤ تو کہ یہ سب کیا ہے؟"

عورت نے سر اٹھایا۔ دھوپ کا بڑے فریم کا چشمہ جیسے صوفیہ کو گھورتا رہا پھر وہ بولی۔ "تم لوگ کچھ عرصے یہاں قید رہو گے۔"

"چلو' کچھ نہ بتاؤ۔ ہمیں بات کرنے اور چلنے پھرنے کی اجازت تو دو۔ ہم یہاں غیر معینہ مدت تک یوں پتھر کے بت بن کر تو نہیں بیٹھ سکتے۔" صوفیہ نے کہا۔

"تم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہوکر ہاتھ پاؤں کھول سکتے ہو۔" عورت بولی۔ "بات بھی کرسکتے ہو مگر آہستہ آہستہ...... لیکن کسی نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو میں اسے شوٹ کردوں گی۔"

کمال بھی سن رہا تھا۔ عورت کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔ اس نے سوچا' کاش میں اس عورت کی آنکھوں میں دیکھ سکتا۔ یہ جسمانی طور پر تو عورت لگتی ہے لیکن نسوانی نرمی اور جذبوں سے محروم ہے۔ یوں وہ بالکل اندھیرے میں تھا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اس کا سابقہ کس سے پڑا ہے۔

صوفیہ نے کرسی کھینچی اور کمال کے برابر میں بیٹھ گئی۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" وہ سرگوشی میں بولی۔ "یہ لوگ کیا کررہے ہیں آخر؟"

کمال کو عجیب سا لگا۔ وہ طلباء کو کلاس میں سرگوشی میں بات کرنے کو منع کرتا تھا لیکن اب خود ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ "میں کیا بتاؤں۔ بس میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ مسلح شخص دروازے پر کھڑا تھا۔"

"تمہیں اندازہ ہے کہ یہ کتنے افراد ہیں؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اب تک میں تین مختلف افراد کو دیکھ چکا ہوں۔"

"میں چار کو دیکھ چکی ہوں۔ ایک نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ گولی دو انچ نیچے چلائی گئی ہوتی تو میں اس وقت یہاں موجود نہ ہوتی۔"

"تم کیسے آ پھنسیں یہاں؟"

"میں یہ دیکھنے آئی تھی کہ تم اپنی کلاس کو لے کر نیچے کیوں نہیں آئے ہو۔"

"کیا باقی سب کلاسیں نیچے پہنچ گئی ہیں؟"

"ہاں۔ پورا اسکول باہر میدان میں جمع ہے۔"

کمال نے پینٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ "پتا نہیں' یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟"

"پتا نہیں۔ اب تک میں تین فائروں کی آواز سن چکی ہوں اور جس شخص نے مجھ پر گولی چلائی تھی' میرے خیال میں وہ زینوں کی ریلنگ سے بم باندھ رہا تھا۔" صوفیہ کہتے کہتے رکی پھر بولی۔ "یہ لوگ جو کچھ بھی کررہے ہیں' اس میں بے حد سنجیدہ ہیں۔ ہم جتنی جلدی یہاں سے نکل جائیں' اتنا ہی بہتر ہے۔"

کمال نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "کوئی احمقانہ قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں صورت حال کو سمجھنا چاہئے۔"

صوفیہ اور اس کے قریب جھک آئی۔ "ہم کھڑکیوں کے راستے نہیں نکل سکتے؟"

کمال نے کن انکھیوں سے رائفل بردار عورت کو دیکھا۔ "اس رائفل کی موجودگی میں تو ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے۔"

اب کلاس میں آوازیں ابھر رہی تھیں۔ لڑکے کھڑے ہونے اور ہاتھ پاؤں کھولنے کی اجازت سے استفادہ کر رہے تھے۔ لڑکیاں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگی تھیں۔ وہ آوازیں ذرا بلند ہوئیں تو رائفل بردار لڑکی مضطرب ہوگئی۔ کمال اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ تاکہ لڑکی کے متشدد ہونے سے پہلے طلباء کو ٹوک سکے لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ دور سے سائرن کی آواز سنائی دی' جو بڑھتی گئی۔ چند ہی لمحے بعد باہر رکنے والی گاڑیوں کے ٹائر چیخے۔ سائرن خاموش ہوگئے تھے۔ کمال کا اندازہ تھا کہ وہ کم از کم چھ گاڑیاں تھیں۔

گاڑیوں کے رکنے کے بعد سنگین خاموشی چھائی۔ یہ جاننے کے بارے میں کہ چکر کیا ہے؟ کمال کا تجسس اور بڑھ گیا!

☆============☆============☆

پرنسپل جمیل الرحمٰن نے اپنے آفس کے دروازے میں کھڑے ہو کر وہ منظر دیکھا۔ پولیس کی گاڑیاں پارکنگ ایریے میں رکیں۔ پولیس کے جوان اچھل کر اترے اور فوراً ہی انہوں نے گاڑیوں کی اوٹ میں پوزیشن سنبھال لیں۔ جمیل الرحمٰن کو صورت حال کی سنگینی کے باوجود وہ اچھا خاصا مسخرا پن لگا۔ وہ چند منٹ انتظار کرتا رہا کہ وہ اس کی طرف آئیں گے لیکن پھر اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ آسانی سے اپنی پوزیشن چھوڑنے والے نہیں۔ چنانچہ وہ خود قریب ترین پولیس کار کی طرف بڑھ گیا۔

جمیل الرحمٰن اس طرف سے بھی پریشان تھا۔ یہ ضرور تھا کہ گزشتہ دس سال میں علاقے کی پولیس کو جدید خطوط پر استوار کیا گیا تھا لیکن علاقے میں بس چھوٹے موٹے جرائم ہی ہوتے تھے۔ یا خاندانی دشمنی کی بنیاد پر کوئی قتل ہوجاتا تھا۔ اس کے خیال میں مقامی پولیس ایسی منظم واردات سے نمٹنے کی اہلیت بہرحال نہیں رکھتی تھی۔ کیونکہ اس کا کسی سنگین چیلنج سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ جمیل الرحمٰن خود بھی اس مسخرے پن میں شامل ہوگیا۔ وہ قریبی کار کی اوٹ میں دبکے ہوئے انسپکٹر کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا۔

"میں انسپکٹر اشفاق ہوں۔" پولیس افسر نے تعارف کرایا۔

"اور میں جمیل الرحمٰن ہوں.......... اس اسکول کا پرنسپل۔"

"اب آپ مجھے بتائیں کہ یہاں کی صورت حال کیا ہے؟"

جمیل الرحمٰن نے تیسری منزل کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں کم از کم دو مسلح افراد موجود ہیں۔ ان میں سے ایک نے ہمارے پی ٹی آئی کو شوٹ کیا ہے۔ اس نے مجھ پر بھی گولی چلائی تھی۔ اس کے فوراً بعد اس نے تیسری منزل کے فیکلٹی روم سے انٹرکام پر مجھ سے بات کی۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ پولیس کو اسکول کی عمارت سے دور رکھا جائے ورنہ بڑا خون خرابہ ہوگا۔ انہوں نے دو ٹیچرز اور ایک پوری کلاس کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔"

"کون سی کلاس ہے وہ؟"

"تیسری منزل پر کمرہ نمبر ۲۱ میں انگریزی کی کلاس ہے۔" جمیل الرحمٰن نے اشارہ کیا۔

"اور ان لوگوں کے مطالبات کیا ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ انہوں نے بتایا نہیں۔"

انسپکٹر آہ بھر کے رہ گیا۔ "خیر یہ تو معلوم ہو ہی جائے گا۔ پہلے تو ہمیں دوسرے معاملات کی فکر کرنی ہے۔ یہاں موجود تمام لوگوں کو باہر نکالنا ہے۔ آپ ایسا کریں' تمام لڑکوں کو کرکٹ اسٹیڈیم میں جمع کرلیں پھر انہیں عقبی گیٹ سے نکالا جائے۔"

"بہت بہتر یہ کام ہوجائے گا۔"

"گڈ۔ جو طلباء ہوسٹل میں رہتے ہیں' انہیں فی الحال کسی اور اسکول میں پہنچایا جائے۔ یہ کام جلد از جلد کرلیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ آزادانہ طور پر بلڈنگ میں آ اور جاسکتے ہیں۔ آپ انٹرکام پر ان سے رابطہ کریں اور پوچھیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم کریں کہ زخمی ٹیچر کو نکالا جاسکتا ہے یا نہیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"مجھے امید نہیں کہ مظفر خان زندہ ہوگا۔"

"کیوں؟"

"اسے صرف چند فٹ کے فاصلے سے شوٹ کیا گیا ہے اور وہ بھی شاٹ گن سے۔"

انسپکٹر اشفاق کی نظریں جھک گئیں۔ "ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ امکان تو کم ہی ہے پھر

بھی ہمیں امید رکھنی چاہئے۔"

جمیل الرحمٰن اٹھ کھڑا ہوا۔ "اور اگر وہ تم سے بات کرنا چاہیں تو؟"

"ہمارے ایس پی صاحب آنے ہی والے ہیں۔ اس معاملے کو وہی نمٹائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" جمیل الرحمٰن نے کہا اور بلڈنگ کی طرف چل دیا۔ جاتے ہوئے اس نے نظریں اٹھا کر تیسری منزل کی طرف دیکھا۔ وہاں اسے ایک سایہ سا نظر آیا۔ وہ اپنے دفتر میں داخل ہوا' جہاں مسز جعفری فون کے پاس بیٹھی اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ "باہر جاؤ اور ٹیچروں سے کہو کہ تمام طلباء کو کرکٹ اسٹیڈیم میں لے جائیں۔ میں انہیں وقتی طور پر کسی دوسرے سکول میں شفٹ کرنے کی بات کرتا ہوں۔ اب اس بلڈنگ میں کسی کو نہیں آنا ہے۔ تم بھی واپس نہ آنا۔" پھر اسے خیال آیا کہ اسکول کا اپنا ہاسٹل اسکول کی بلڈنگ سے خاصا دور اور محفوظ ہے۔

"اور آپ؟"

"اسکول کا پرنسپل بھی بحری جہاز کے کیپٹن کی طرح ہوتا ہے۔ اسے بھی جہاز کے ساتھ ڈوبنا ہوتا ہے۔" جمیل الرحمٰن کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔

"اس کی ضرورت تو نہیں.........." مسز جعفری نے کہا۔

"مجھے یہاں کچھ کام کرنے ہیں پھر میں بھی نکل جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔" پرنسپل نے کہا اور اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر وہ سوچتا رہا۔ اسے اپنے پیٹ میں گرہیں سی پڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسا ہمیشہ ہوتا تھا۔ ایک ایسے اسکول کا پرنسپل ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا' جو مغربی طرز پر چلایا جا رہا ہو اور جس میں بڑے اہم لوگوں کے بچے پڑھتے ہوں۔ مسائل ہی مسائل تھے' جن سے نمٹنا پڑتا تھا۔ مسائل کھڑے کرنے والے طلباء سے خوش اسلوبی سے نمٹنا' انتظامی مسائل حل کرنا اور ٹیچرز کا خیال رکھنا۔ یہ عہدہ ویسے ہی پھولوں کی سیج نہیں تھا کہ یہ نئی افتاد.......... اسے مظفر خان کا خیال آیا تو پریشانی اور بڑھ گئی۔

اس نے ہاسٹل کی میٹرن سے بات کرنے کے لئے ریسیور اٹھایا۔

☆==========☆==========☆

بابر کھڑکی سے ہٹا اور فیکلٹی روم کی طرف چل دیا۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ دوبارہ پرنسپل سے خود رابطہ کرے یا ان کے رابطہ کرنے کا انتظار کرے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ پرنسپل اور پولیس کے درمیان کیا طے پایا ہے۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے دوطرفہ ریڈیو کا بٹن دبایا۔ "کہو' باہر کیا ہو رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

شہناز کی بے حد صاف اور واضح آواز سنائی دی۔ "طلباء کرکٹ اسٹیڈیم کی طرف جا رہے ہیں۔ پارکنگ ایریے میں چھ پولیس کاریں کھڑی ہیں۔ پانچ پولیس کاریں اسکول کی عمارت کے باہر سڑک پر موجود ہیں۔ ایک منٹ.......... ایک اور گاڑی اسکول میں داخل ہو رہی ہے.......... پولیس کی ہی گاڑی ہے اور ہاں.......... ' ایمبولنس بھی اسکول میں داخل ہوئی ہے۔"

"پولیس والے کیا کر رہے ہیں؟" بابر نے پوچھا۔

"وہ بس اپنی گاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔"

"صورت حال میں کوئی تبدیلی ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔"

ریڈیو آف کرکے بابر نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی۔ چند ہی لمحے ہوئے ہوں گے کہ انٹر کام کا بزر چیخا۔ تین چار بزر کے بعد اس نے ریسیور اٹھایا۔ "تم یقیناً جمیل الرحمٰن ہوگے۔" اس نے کہا۔ "ہاں مجھے بتاؤ کہ کیا صورت حال ہے؟"

"صورت حال تو تم مجھے بتاؤ گے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ظاہر ہے' تم خود کو مجھ سے متعارف تو کرانے سے رہے۔"

"اس کے بعد تم پوچھو گے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ ان گھسے پٹ سوالات کے علاوہ بھی کچھ ہے تمہارے پاس؟" بابر نے کہا۔ "بہرحال میں تمہیں ایک مشورہ دوں گا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں یہاں سے لاشیں نیچے پھینکنا شروع کردوں گا۔ لہٰذا ہمارے خلاف کوئی جارحیت نہیں ہونی چاہئے۔"

"ایسا کرکے تم بچ نہیں سکو گے۔"

"میں تو موت کا کھیل کھیل رہا ہوں۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں بس تم پولیس کو

اس عمارت سے دور ہی رکھو۔"

"اب مجھے گھسا پٹا سوال کرنا ہی پڑے گا۔" دوسری طرف سے پرنسپل نے کہا۔

بابر نے کرسی میں پہلو بدلا۔ اب اسے اس گفتگو میں مزہ آرہا تھا۔ "ہم کون ہیں؟ اس سے تو تمہیں غرض نہیں ہونی چاہئے۔ فی الحال تم ہمیں تیسری منزل کے دہشت گرد کہہ سکتے ہو۔ جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب میں تمہیں نہیں دوں گا۔ تم میرا یہ پیغام پولیس والوں تک پہنچا دو کہ وہ اس عمارت کے پاس نہ پھٹکیں۔ میں ٹھیک ۴۵ منٹ بعد اسٹیڈیم کے ساتھ والے جمنازیم میں انٹر کام پر مزید ہدایات دوں گا۔ اگر اس وقت تک یہ میدان صاف نہ ہوا اور پولیس نہ ہٹی تو میں تمہارے ایک اسٹوڈنٹ کو ہلاک کر کے نیچے پھینک دوں گا۔ اس کے بعد اپنی یہ شرط پوری ہونے تک میں ہر پانچ منٹ بعد ایک طالب علم کو موت کے گھاٹ اتارتا رہوں گا۔"

"اور مظفر خان کے متعلق کیا کہتے ہو؟"

"کون مظفر خان؟"

"وہی جسے تم نے گولی مار دی ہے۔"

"وہ تو ہر چیز سے بے نیاز ہو چکا ہے۔"

"اسے ہم عمارت سے نکال سکتے ہیں؟"

"ایمبولینس کے عملے کو اوپر بھیج دو۔ ان کے علاوہ کوئی نہیں آئے گا۔ اس کی لاش ہم نے دوسری منزل پر پہنچا دی ہے۔"

"یعنی اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ زندہ ہو گا؟"

"نہیں اور اگر ہماری بات نہیں مانی گئی تو اور لوگ بھی مریں گے۔" یہ کہہ کر بابر نے ریسیور رکھ دیا اور ہنسنے لگا۔ وہ بہت خوش تھا۔

☆============☆============☆

ایس پی جلیس احمد اپنے اکلوتے بیٹے کی طرف سے بہت فکرمند تھا۔ نعمان ان دنوں کچھ زیادہ ہی بدتمیز ہو گیا تھا۔ بلکہ لگتا تھا' وہ اسے چڑانے کے لئے جان بوجھ کر بدتمیزی کرتا ہے۔ ان دنوں وہ ضد کر رہا تھا کہ اس کا ڈرائیونگ لائسنس بنوایا جائے اور

اسے موٹر سائیکل لے کر دی جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کا بیٹا ہونے کے ناتے یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ جبکہ دوسرے لڑکے رشوت دے کر لائسنس بنوا چکے ہیں۔ جلیس نے اسے دو ٹوک انداز میں بتا دیا تھا کہ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہو گا تو اس کے مطالبات پورے کر دیئے جائیں گے۔ ورنہ وہ ایسی کوئی توقع نہ رکھے۔

اس صبح جلیس کی بیوی صفیہ نے اسے نعمان کے سلسلے میں کافی سمجھایا تھا۔ "دیکھو' سولہ سال کا لڑکا جوان ہوتا ہے۔ تمہیں اپنا رویہ تبدیل کر لینا چاہئے۔ اس کے مطالبات فطری ہیں۔"

"لیکن وہ غیر ذمے دار ہے۔ ایسے لڑکے کو ڈرائیونگ لائسنس دلانا......... موٹر سائیکل دلانا......... یہ تو قتل اور خودکشی کا لائسنس دلانا ہے۔"

"اس کے ہم عمر ساتھیوں کے پاس یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔"

"ہوتی رہیں۔ میں اپنے اصولوں پر سمجھوتا نہیں کر سکتا۔"

"لیکن اس کے ساتھ نرمی تو برت سکتے ہو۔"

"اس کے بڑھے ہوئے بال' اس کا حلیہ دیکھ کر مجھے غصہ آجاتا ہے۔"

"اس سے محبت کا اظہار کرو' نرمی سے سمجھاؤ تو وہ ہنسی خوشی خود کو تبدیل کر لے گا۔" صفیہ نے کہا۔ "دیکھو نا......... ہمارا تو کُل سرمایہ وہی ہے۔ تم پولیس میں ہو۔ ڈسپلن کے آدمی ہو۔ سڑکوں پر حادثات دیکھتے رہتے ہو لیکن اس پر ڈسپلن تھوپو نہیں' نہ وہ اتنا بڑا ہے کہ ڈسپلن کی اہمیت سمجھے اور نہ اتنا چھوٹا کہ سڑکوں پر اپنی اور دوسروں کی بقا کا خیال نہ رکھ سکے۔ تمہارا رویہ اسے بگاڑ رہا ہے۔ سرکش بنا رہا ہے۔"

جلیس جانتا تھا کہ اس معاملے میں صفیہ سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ وہ مانتا تھا کہ صفیہ اس سے زیادہ سمجھ دار ہے۔ "ٹھیک ہے صفیہ۔ آج شام وہ آئے گا تو میں اس سے نرمی سے بات کروں گا۔"

"یقین کرو۔ وہ برا لڑکا نہیں۔ اس کی اسکول کی کارکردگی بھی اتنی خراب نہیں۔ بس وہ تمہاری توجہ اور محبت چاہتا ہے۔"

"تم جانتی ہو' میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں........." جلیس نے شکایتی لہجے میں

کہا۔

"مگر اسے تو نہیں معلوم' اپنی محبت ظاہر بھی کیا کرو۔ اسے وقت بھی دیا کرو۔"

"اچھا بیوی۔ اب ایسا ہی کروں گا۔" اس نے کہا اور دفتر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

دفتر میں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ وہ مختلف تھانوں سے آئی ہوئی رپورٹیں دیکھتا رہا۔ ساڑھے بارہ بجے اس نے کھانا کھایا۔ ڈیڑھ بجے وہ کال موصول ہوئی۔ وہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس لئے وہ خود نکلا۔ باہر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ ڈرائیور بھی موجود تھا۔ "ہمیں مری چلنا ہے۔" اس نے ڈرائیور سے کہا "اور تیز ترین رفتار سے۔"

پھر اس نے ریڈیو پر متعلق تھانے سے رابطہ کر کے کمک طلب کرلی۔

یہ خیال تو اسے راستے میں آیا کہ نعمان بھی اسی اسکول میں پڑھتا ہے۔

☆============☆============☆

بابر کلاس روم میں داخل ہوا تو اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ سب کچھ اس کی مرضی کے خلاف تھا۔ کلاس میں نقل وحرکت بہت زیادہ تھی لیکن اس کے کلاس میں داخل ہوتے ہی خاموشی چھا گئی۔ طلباء اس کی ایک ایک حرکت کو شک آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ جواباً انہیں گھورنے لگا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کی نظریں جھک گئیں اور وہ پہلو بدلنے لگا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ ٹیچرز کی طرف متوجہ ہوا۔ "میں اس میز پر بیٹھوں گا۔" اس نے کہا "تم لوگ طلباء کے پاس چلے جاؤ۔" اس نے شاٹ گن لہرا کر اشارہ کیا۔

دونوں ٹیچر کھڑکی کے پاس پڑی دو خالی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ بابر میز کے عقب میں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور دونوں ٹانگیں میز پر پھیلا دیں۔ شاٹ گن اس نے دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھ لی۔ "میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ ٹیچر ہونا کیسا ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔ "اب پتا چل رہا ہے۔ یہ تو بڑی عیاشی کی زندگی ہے۔ کمال' تم اس طرح پڑھاتے ہو۔"

کمال نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ دیکھنے کے لئے عقاب کی چونچ جیسی ناک اور پتلے پتلے ہونٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ "نہیں مجھے پڑھانے کے لئے گن کی ضرورت

نہیں پڑتی۔" اس نے جواب دیا۔

"اور لیڈی ٹیچر تم؟ تم بھی ایسی ہی کوئی عقل مندی کی بات کہنا چاہو گی؟" بابر صوفیہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"میں بہت کچھ کہہ سکتی ہوں لیکن تم سننا پسند نہیں کرو گے۔" صوفیہ نے کہا۔

"اوہ.......... بہت تیز طرار ہو؟"

"یہ بتاؤ تم ہمیں یہاں کب تک قید رکھو گے؟"

بابر نے صوفیہ کے سوال کو نظر انداز کردیا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"صوفیہ۔"

"صوفیہ' مجھے خوشی ہے کہ ہمیں تم کو شوٹ نہیں کرنا پڑا۔ تمہارے وجود سے تو یہاں رنگینی ہے۔ نذیر رنگینیوں کا عاشق ہے۔ اگرچہ تم اس کے ٹائپ کی نہیں ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ بالآخر وہ تمہیں پسند کرنے لگے گا.......... یہ سوچ کر کہ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔ کہو کیا خیال ہے تمہارا؟"

کمرے کی خاموشی اور سنگین ہوگئی پھر اس خاموشی کو کمال نے توڑا۔ "مجھے یقین ہے کہ صوفیہ اسے پسند نہیں کرے گی اور اگر نذیر اس شخص کا نام ہے' جو تم لوگوں میں سب سے اچھا اور معقول لگتا ہے' تو وہ خود بھی اس صورت حال سے بچے گا۔ تم کیوں اسے مشکل میں ڈال رہے ہو۔"

بابر مسکرایا۔ "تم یقیناً اچھے ٹیچر ہو گے۔ زبان بہت چلتی ہے تمہاری۔" اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔ "لیکن یہ نہ بھولنا کہ ہمارے پاس الفاظ نہیں' گنیں ہیں۔"

جواباً کمال بھی مسکرایا۔ "سوال یہ تھا کہ تم ہمیں کب تک یہاں قید رکھو گے؟"

"ضرورت سے زیادہ ایک منٹ بھی نہیں۔"

"میں ایک اور آسان سوال کروں۔ ان بچوں کو پانی پینے اور باتھ روم وغیرہ جانے کی اجازت کب ملے گی؟"

بابر نے شاٹ گن اپنے پیروں کے پاس سے اٹھائی اور میز کے کنارے پر رکھ لی۔

"ایک گھنٹے بعد.......... ذرا گرد بیٹھ جائے۔ پھر انہیں یوٹی کا وقفہ ضرور دیا جائے گا۔ ہے

کوئی ایسا جو اتنی دیر انتظار نہ کرسکے۔" اس نے شاٹ گن گھمائی اور اس کا رخ کمال کی طرف کردیا پھر وہ بولا "یہ بڑی بور کلاس ہے مسٹر کمال۔ یہ لوگ تو سوالوں کے جواب بھی نہیں دیتے۔ ہاں۔ میں تمہیں بتا دوں میں نے اس بلڈنگ میں کافی وقت گزارا ہے۔ رات کے وقت' جب یہاں کوئی موجود نہیں ہوتا تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ یہ کمال رشید کیسا آدمی ہوگا۔ دراز قد' خوش رو اور دیکھنے میں اپنی عمر سے کم اور یہ صوفیہ خاتون بھی خاصی خوش شکل ہیں۔ مجھے یقین ہے تم دونوں کے درمیان ضرور کوئی چکر چل رہا ہے۔" وہ طلباء کی طرف مڑا "کیوں بھئی' تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ مجھے یقین ہے' ان کے درمیان غیر اخلاقی تعلق ہے اور تم لوگوں کو پتا ہی نہیں۔ دیکھو' صوفیہ بیگم کا چہرہ کیسا سرخ ہو رہا ہے۔ اس بدلتی رنگت نے پول کھول دیا نا؟ کیوں کمال' یہ صوفیہ کیسی ہے۔ خوش ذائقہ' کھٹی میٹھی۔ ہے تو دھان پان سی مگر یہ دبلی پتلی عورتیں ہوتی بڑی زبردست ہیں۔"

کمال نے بہت برداشت کیا مگر بالآخر اس کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر بابر کی طرف بڑھا۔ بابر نے شاٹ گن اٹھا کر گھمائی اور ٹریگر دبا دیا۔ چھوٹے سے کمرے کو اس دھماکے نے ہلا کر رکھ دیا۔ کچھ لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ لڑکے ڈیسکوں کے نیچے جھک گئے۔ کچھ کتابیں اور دوسری چیزیں گر گئیں۔ صوفیہ اپنی کرسی پر یوں بیٹھی تھی' جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ بابر نے بڑے سکون سے خالی کارتوس باہر نکال کر ایک طرف اچھالا اور گن کا رخ پھر کمال کی طرف کردیا۔

کمال نے گن کو نظرانداز کردیا۔ وہ اس میز کے سامنے پہنچ کر رکا جس کے پیچھے بابر بیٹھا تھا۔ "تم اپنا یہ ڈراما جس طرح چاہو' چلاؤ لیکن مجھے امید ہے کہ تم تہذیب' شرافت اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑو گے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"میں اس کھیل کے ضابطے بتا دوں مسٹر کمال رشید۔" بابر نے سرد لہجے میں کہا "میری ہر بات تمہیں برداشت کرنا ہوگی۔ اگلی بار ایسی جسارت کی تو دونوں کو شوٹ کردوں گا۔ لگتا ہے' فی الوقت میں تمہیں ڈراؤنا نہیں لگ رہا ہوں مگر آخر میں تم مجھ سے خوف کھاؤ گے۔" وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ شاٹ گن کا رخ اب بھی کمال ہی

کی طرف تھا۔ "میں کچھ دیر کے لئے تمہیں اکیلا چھوڑ رہا ہوں۔ تاکہ صورت حال پر غور کرلو لیکن یاد رہے کہ طلباء کو فرار کرنے کی اسکیم بنانا مناسب نہیں ہوگی۔ ہم تمہیں کبھی اتنی دیر اکیلا نہیں چھوڑیں گے کہ اس پر عمل کرسکو۔ اگر تم میں سے چند ایک نکل بھی گئے تو اس کی سزا باقی لوگ بھگتیں گے۔" یہ کہہ کر وہ پلٹ کر دیکھے بغیر دروازے سے نکل گیا۔ راہداری میں اسے نذیر مل گیا۔ وہ دونوں ساتھ ہی فیکلٹی روم کی طرف گئے۔

"میں ایک بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں نذیر۔" بابر بڑبڑایا۔

"کیا؟"

"میں آخر میں اس ذلیل آدمی کو ضرور قتل کروں گا مگر پہلے میں اسے حقیر کیڑے کی طرح رینگنے پر مجبور کروں گا پھر اس کی موت کے ایک ایک لمحے سے لطف اٹھاؤں گا۔ میرے سامنے تن کر کھڑے ہونے کی جرأت کرنے والے کی جان بخشی نہیں ہوسکتی۔"

☆==========☆==========☆

کلاس روم میں صوفیہ سرگوشی میں غرائی۔ "کمینہ کہیں کا۔" اور کمال حیران رہ گیا۔ اس نے کبھی تنہائی میں بھی صوفیہ کو بدکلامی کرتے نہیں سنا تھا۔ کجا یہ کہ بھری کلاس کے سامنے۔ طلباء نروس انداز میں ایک دوسرے سے باتیں کررہے تھے۔ کچھ شاک کی حالت میں خاموش بیٹھے تھے۔ دو لڑکیاں چپکے چپکے رو رہی تھیں۔ ایک لڑکے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ کمال کا اب تک خیال تھا کہ وہ لوگ خود کو بہت اچھی طرح سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ صوفیہ کی طرف بڑھا اور نرمی سے اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔ "پُرسکون رہو۔" اس نے تلقین کی۔ "ہمیں ان بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" صوفیہ بولی "ہمیں کسی نہ کسی طرح انہیں یہاں سے نکالنا ہے۔"

"میں اس کی دھمکیوں کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔"

"تو کیا کرنا چاہئے؟" صوفیہ اس سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

"طلباء کو ڈیسکوں سے اٹھا کر ایک کونے میں جمع کرنا ہے۔ یوں وہ ایک دوسرے

سے قریب رہ کر ایک دوسرے کا زیادہ بہتر طور پر خیال رکھ سکیں گے۔ میرا خیال ہے۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن وہ لڑکیوں کو تولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ سامان ترغیب نمایاں رہے۔"

وہ دونوں اٹھے۔ انہوں نے طلباء کے پاس جاکر انہیں تسلی دی۔ انہیں سمجھایا کہ وہ ان ہم جماعتوں کی ڈھارس بندھائیں، جو بہت پریشان ہیں اور ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھے ہیں۔ کمال بڑے تحمل اور نرمی سے طلباء کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ اس نے انہیں یقین دلایا کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ وہ لوگ اکٹھے ہوکر سکون سے بیٹھ گئے تو کمال او صوفیہ کلاس روم کے اگلے حصے میں چلے گئے۔

صوفیہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔ "اب ک کریں؟"

کمال برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہ شادی پروگرام طے کیا جائے۔"

☆============☆============☆

ایس پی جلیس احمد اسٹیڈیم کی چھت پر پیٹ کے بل لیٹا دوربین کی مدد سے اسکول کی عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ تیسری منزل کی کھڑکیوں کے شیشے پر سیاہ بادلوں کا عکس رہا تھا۔ جس کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک کمرا اس سے مستثنیٰ تھا۔ کونے کے اس کلاس روم کی ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس سے اندر کے منظر کی ایک دھند سے جھلک نظر آرہی تھی۔ جلیس نے اپنی گھڑی دیکھی اور چھت سے اترنے لگا۔ اسٹیڈ کے اسکور بورڈ والے چھوٹے سے کیبن کو اس نے براڈ کاسٹنگ بوتھ بنالیا تھا۔ اس بوتھ میں پرنسپل جمیل الرحمٰن اس کا منتظر تھا۔ "کیوں......... کیا رہا؟" پرنسپل نے اس سے پوچھا۔

"ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے۔ غالباً گولی سے، لیکن میں اندر نہیں دیکھ سکا۔ روشنی ہونے کے بعد یہ ممکن ہوسکے گا۔"

"کوئی پروگرام بھی بنایا تم نے؟"

جلیس نے پھر گھڑی میں وقت دیکھا۔ "تیسری منزل پر پہنچنا ایک بڑا مسئلہ ہے۔" بہرحال اندھیرا ہونے کے بعد میرے آدمی جمنازیم کے راستے عمارت کے عقبی حصے میں پہنچیں گے۔ مجرموں کے لئے انہیں دیکھنا ممکن نہیں ہوگا۔ میرے کچھ آدمی جمنازیم کی چھت پر رہیں گے لیکن ہم کچھ بھی کریں، کیسی ہی احتیاط کریں، مسلح تصادم ناگزیر ہے۔ ایک بات سنیں۔ چھت میں کھلنے والا ٹریپ ڈور بھی یقیناً ہوگا۔ وہ کہاں کھلتا ہے؟"

"اسٹور روم میں اور اسٹور روم بھی اسی راہداری میں ہے۔"

"مجھے اس منزل کا نقشہ بنادیں۔"

"راہداری ہے، جو لمبائی کے رخ پر پوری عمارت میں موجود ہے۔ سامنے کے حصے میں دس اور عقبی حصے میں چھ کلاس روم ہیں۔ درمیانی زینوں کے بائیں طرف فیکلٹی روم ہے اور داہنی طرف اسٹور روم ہے۔ فیکلٹی روم اور اسٹور روم، دونوں کے ساتھ تین تین کلاس روم ہیں پھر ریسٹ روم ہیں اور آخر میں کونے والے زینے ہیں۔"

"ہمارے لیے دو ہی زینے بچتے ہیں۔" جلیس نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اس طرف والے زینے کا دفاع تو بہت آسانی سے کرسکتے ہیں۔ آگ سے بچاؤ والے دونوں زینے بھی بیکار ہیں۔ ایک بہت دور ہے اور دوسرا ان کی نظروں کے سامنے۔ ہمیں کلاس روم سے قریب ترین زینہ استعمال کرنا ہوگا۔ اگر ہم اپنے کچھ آدمی اسٹور روم میں پہنچا دیں تو شاید انہیں حیران کرنے اور راہداری صاف کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔"

"تم پُرجوش تو نہیں لگتے۔" پرنسپل نے کہا۔

"ہوں بھی نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان لوگوں کی تعداد کتنی ہے اور پھر میں کچھ بھی کرلوں، یہ معاملہ بہرحال وقت طلب ہے اور اس دوران وہ کچھ طلباء کو موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔"

وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے خاموش بیٹھے رہے۔ جلیس عمارت کے لے آؤٹ اور اس میں گھسنے کے طریقوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے آدمیوں کو مختلف جگہوں پر رکھ کر دیکھ رہا تھا، جیسے بساط پر مہرے رکھے جاتے ہیں۔ وہ ایک کامیاب آپریشن کی منصوبہ بندی کررہا تھا۔ ایک جوان آگ سے بچاؤ والے ڈور کے زینے پر جائے

اور راہداری میں گیس کے بم اچھالے- اسی لمحے بلٹ پروف پہنے ہوئے تیس جوان اسٹور روم سے نکل کر زینوں پر جھپٹیں گے۔ امکان یہی تھا کہ بغیر کسی فائر کے وہ دہشت گردوں پر قابو پالیں گے۔ وہ اپنے ساتھ جو جمعیت لایا تھا' انہیں دہشت گردی سے نمٹنے کے لئے کمانڈو تربیت دی گئی تھی۔ وہ اس قسم کی کارروائی کی پوری اہلیت رکھتے تھے۔

بہرحال ایسا ہو یا نہ ہو' اس کی خواہش یہی تھی کہ پورا آپریشن صاف ستھرے انداز میں خون بہے بغیر ہوجائے۔ اسے اپنے بیٹے نعمان کی بھی فکر تھی لیکن اس نے اس کے خیال کو ذہن کے عقبی حصے میں دھکیل دیا تھا۔ پرنسپل دفتر سے نکلتے ہوئے اپنے ساتھ بدنصیب کلاس میں موجود طلباء و طالبات کی فہرست لایا تھا۔ اس فہرست میں نعمان کا نام دیکھ کر خدشہ حقیقت میں بدل گیا تھا۔

انٹرکام کے بزر نے ان دونوں کو چونکا دیا' جلیس نے ریسیور اٹھایا "یس؟"

"اوہ......... نئی آواز" دوسری طرف سے کہا گیا "تم کون ہو بھئی؟"

"میں ایس پی جلیس احمد بول رہا ہوں۔"

"یہ تو ہماری عزت افزائی ہے کہ ایس پی صاحب بنفس نفیس یہاں تشریف لائے ہیں۔ میں تمہیں اپنا نام تو نہیں بتا سکتا لیکن خیر۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس کال کے منتظر ہوگے۔ اس خیال سے کہ ہم سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں تم ہمارے خلاف آپریشن کا مؤثر منصوبہ بنا سکو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں مایوس کررہا ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ تمہاری کوئی کارروائی کامیاب نہیں ہوسکتی۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو؟" جلیس نے سرد لہجے میں کہا۔

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تمہارے عزائم خطرناک نہیں پھر بھی احتیاطاً میں چند باتیں بتا دوں۔ تینوں زینوں پر ڈائنامائٹ کے بم بندھے ہوئے ہیں۔ الیکٹرونک ٹریگر والے۔ تم لوگوں نے اوپر آنے کی کوشش کی تو تم پر جہنم کے دروازے کھل جائیں گے۔ چھت کا راستہ البتہ کھلا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اسٹور روم میں ٹریپ ڈور کھلتا ہے لیکن اول تو تم ہمارے علم میں آئے بغیر وہاں پہنچ ہی نہیں سکو گے' پہنچ بھی گئے تو کوئی فائدہ

نہیں ہوگا ہم نے نہ صرف ٹریپ ڈور کو اندر سے بند کردیا ہے بلکہ ڈائنامائٹ بھی لگادیا ہے۔"

"بہت خوب" جلیس نے کہا۔ اس کے دماغ نے خودکارانہ انداز میں متبادل منصوبے پر کام شروع کردیا تھا۔

"اب تفصیلات سن لو۔ تمہیں کل شام تک پانچ کروڑ روپے کا بندوبست کرکے ہم تک پہنچانا ہے۔ سو روپے سے بڑا کوئی نوٹ نہیں ہونا چاہئے۔ کسی نوٹ پر نشان نہ ہو اور نوٹ سیریل کے نہ ہوں۔ فی الحال یہی ایک کام ہے تمہارے لئے اور ڈیڈ لائن ہے کل شام چھ بجے۔ اس کے بعد موت کا کھیل شروع ہوجائے گا۔"

"بس؟ یعنی تمہیں صرف دولت کی ضرورت ہے؟"

"تمہیں شاید مایوسی ہوئی۔ حالانکہ یہاں سب کچھ دولت سے ہی ہوتا ہے۔ سیاست بھی دولت کے بغیر نہیں چلتی۔ اپنے سیاست دانوں سے......... سیاسی جماعتوں سے پوچھو کہ وہ منشیات فروشوں سے کیوں تعلقات رکھتے ہیں۔ بہرحال تم فکر نہ کرو۔ میرے منصوبے اور بھی ہیں لیکن میں ان پر تم سے تبادلہ خیال نہیں کروں گا۔"

"اور رقم تمہیں مل جائے گی تو پھر کیا ہوگا؟"

"اس موضوع پر کل بات کریں گے۔ ویسے مجھے تمہارا رویہ پسند آیا۔ تم نے یہ نہیں کہا کہ کل تک اتنی بڑی رقم کا بندوبست کیسے کیا جاسکتا ہے۔ بس تم رقم کا بندوبست کرو۔"

"رقم تمہیں مل جائے گی" جلیس نے کہا اور دل میں سوچا "کرنسی کی شکل میں نہیں بلکہ موت کے روپ میں۔"

"گڈ۔ پھر کل صبح بات ہوگی اس دوران تم اسکول کی عمارت سے دور رہنا" اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہوگیا۔

جلیس ریسیور رکھنے کے بعد جمیل الرحمٰن کی طرف مڑا "انہوں نے آخری جزئیات تک مکمل منصوبہ بنایا ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے' اس عمارت سے پوری طرح واقف ہے۔ ایک بات بتائیں' آپ نے حال ہی میں کسی کو ملازمت سے تو نہیں نکالا

ہے؟"

"نہیں۔"

"تو کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی دن میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر اسکول کا جائزہ لے سکے؟"

"کوئی بڑا ایسا نہیں کرسکتا۔ میں اور دوسرے منتظمین ہر آدھے گھنٹے بعد پورے اسکول کا راؤنڈ کرتے ہیں۔"

"یہ عمارت کبھی خالی تو نہیں رہتی۔"

"صفائی کرنے والا عملہ چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔ ہاں' جمعہ کو ان کی چھٹی ہوتی ہے۔ جمعرات کی رات وہ جاتے ہیں اور ہفتے کی صبح ڈیوٹی پر آتے ہیں۔"

"یعنی کوئی شخص جمعرات اور جمعے کی راتیں اسکول میں گزارے تو اسکول کے متعلق بہت کچھ معلوم کرسکتا ہے۔"

"مائی گاڈ! پھر تو وہ میرے دفتر میں بھی گھس سکتا ہے۔ دفتر میں عمارت کے مکمل نقشے۔ اسٹاف کی تفصیل اور کلاس کا شیڈول سبھی کچھ موجود ہے۔ ایک فوٹو اسٹیٹ مشین بھی ہے۔"

جلیس نے جمیل کی طرف سگریٹ بڑھائی' سگریٹ سلگانے میں مدد دی اور خود بھی سگریٹ سلگائی "ان کی تیاری خواہ کتنی ہی مکمل ہو' مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں بس انہیں پکڑنا چاہتا ہوں۔ عمارت میں گھس کر......... اس سے پہلے کہ وہ تاوان کو یا کسی یرغمالی کو ہاتھ بھی لگا سکیں۔ میرے ذہن میں کئی آئیڈیے ہیں لیکن پہلے مجھے پانچ کروڑ کی فکر کرنی ہے۔ اس کے لئے مجھے اسلام آباد میں وزارت داخلہ سے رابطہ کرنا ہے۔"

جمیل الرحمٰن نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ اس دہشت گرد کے بارے میں سوچ رہا تھا جو راتوں کو سنسان اسکول میں آزادانہ دندناتا رہا تھا۔ اس نے تصور میں اسے اپنے دفتر میں' اپنی کرسی پر بیٹھ کر اپنے کاغذات اور ریکارڈز کا مطالعہ کرتے دیکھا۔ اس کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔

☆============☆============☆

بابر فیکلٹی روم میں پُرسکون بیٹھا تھا۔ اس نے ٹرے میں سے اپنے لئے ایک سینڈوچ اٹھایا اور تھرماس سے پیالی میں کافی انڈیلی......... وہ مطمئن تھا کہ آپریشن اس کی توقع کے مطابق آگے بڑھ رہا ہے۔ کوئی غیر معمولی اور غیر متوقع رکاوٹ اب تک' سامنے نہیں آئی تھی۔ صورت حال پوری طرح اس کے قابو میں تھی۔ بس وہ ایک طرف سے فکرمند تھا۔ کمال رشید کی طرف سے۔ جمیل الرحمٰن کے دفتر میں موجود فائل میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا' جس سے اندازہ ہوتا کہ کمال رشید اس کے لئے مسئلہ بنے گا۔ اس کی شخصیت میں جارحیت کی کوئی علامت نظر نہیں آئی تھی۔ وہ فزیکل کوچ بھی نہیں تھا۔ نہ وہ ٹیچرز ایسوسی ایشن کا ممبر تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہت اہل ٹیچر تھا۔ اس لئے اس نے بڑی احتیاط سے کمال رشید کی کلاس کو منتخب کیا تھا۔ اس نے کسی خاتون ٹیچر کو یوں منتخب نہیں کیا کہ یوں ڈسپلن کے مسائل کھڑے ہوسکتے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ ٹیچر ایسا ہو' جو اپنی کلاس پر قابو پانا جانتا ہو۔

مگر اب اس کا خیال مختلف تھا!

شہلا آئی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے بھی ٹرے سے ایک سینڈوچ اٹھایا "یہ کام تو ہماری توقع سے بھی آسان ثابت ہوا ہے۔" وہ بولی۔

"جب تک یہ معلوم ہوتا رہے کہ باہر کیا ہو رہا ہے' کام آسان ہی ہوتا ہے" بابر نے کہا۔

"ان بچوں کا کیا کرو گے۔ اب وہ بے چینی سے پہلو بدل رہے ہیں۔"

"انہیں ایک ایک کرکے باتھ روم میں جانے دو۔"

"ہم میں سے کسی کا ساتھ جانا ضروری ہے؟"

"نہیں۔ بس مشکور کو کونے والے زینوں پر کھڑا کردو اور تم درمیانی زینوں پر کھڑی رہو۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔"

☆============☆============☆

شہناز اپارٹمنٹ کی کھڑکی میں کھڑی اسکول میں ہونے والی سرگرمیاں دیکھ رہی تھی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود صاف ظاہر تھا کہ صورت حال پوری طرح بابر کے قابو

میں ہے۔ تمام طلباء کو پچھلے گیٹ سے رخصت کردیا گیا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں پارکنگ سے ہٹالی گئی تھیں۔ آخر میں ایمبولنس والے رخصت ہوئے تھے' وہ اسٹریچر پر کسی کو ڈال کر باہر لائے تھے اور اسے ایمبولنس میں ڈال دیا گیا تھا۔ شہناز کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ لاش ہے' جس سفید چادر سے اس کا منہ ڈھانپا گیا تھا' وہ درمیان سے سرخ ہورہی تھی او اسٹریچر لانے والوں کے انداز میں عجلت بھی نہیں تھی۔ ان کے جانے کے بعد اس ـ اسکول کے پرنسپل کو عمارت سے نکل کر اسٹیڈیم کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کے انداز او حرکات سے شکست خوردگی ظاہر ہورہی تھی۔

شہناز سوچتی رہی۔ بابر ان سب سے برتر ہے۔ وہ ڈوریاں ہلاتا ہے اور دوسر اس کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ ایک اعتبار سے اسے ان لوگوں پر ترس رہا تھا۔ یہ تو ان لوگوں کی بے بسی کا محض آغاز تھا۔ ان کا بابر سے کوئی مقابلہ نہیں تھا ان کی زندگی اور موت کے سوئچ بابر کے اختیار میں تھے۔ ان لوگوں کو بابر کا ہم پلہ ہو کے لئے بابر کی سطح تک آنا تھا اور اتنے کم وقت میں وہ اتنا زیادہ گر نہیں سکتے تھے۔ یہا لوگوں کے لئے ایک ڈراؤنا خواب تھا جو اس کی شخصیت کا حصہ بن جائے گا......... ہمیشہ کے لئے جیسے اس کے لئے ویڈیو والے توقیر کی کمینگی ایک ڈراؤنا خواب تھی جسے وہ کبھ نہیں بھول سکتی تھی۔ ہر ضائع ہونے والی زندگی وہ ہوگی جسے وہ کسی بھی طرح نہیں بچاسکے لیکن وہ ان کی ذمے داری ہوگی۔ یہی تو فرق ہے نیکی اور بدی میں۔ نیکی کرنا کتنا دشوا ہوتا ہے......... اور نیکی کے کئی مطالبے ہوتے ہیں جبکہ بدی کتنی آسان ہے۔ ارادہ ک اور کرلی۔ اس لئے کہ بدی کو انسانی زندگی کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی......... جیسے ویڈیو وا توقیر! اس نے زور سے سر جھٹکا۔ آج نہ جانے کیوں اسے اپنی تباہی کا وہ سیاہ باب رہ رہ ک یاد آرہا تھا' جس کا مرکزی کردار توقیر تھا۔

اسٹیڈیم والے دروازے سے گاڑیاں مسلسل آ اور جا رہی تھیں۔ وہ سحر زدہ ـ اس نقل وحرکت کو دیکھتی رہی۔ بلٹ پروف پہنے اور ہیلمٹ لگائے پولیس والے آ اور گنیں لے کر مستعد کھڑے ہوجاتے جیسے ایکشن کے لئے تیار ہوں مگر کچھ ہی دیر بعد اسٹیڈیم کے کسی اسٹینڈ میں بے فکری سے سگریٹ پیتے نظر آتے۔ ایک دوسرے ـ

مذاق کررہے ہوتے۔ جو کچھ بھی تھا' شہناز ان سے بہت دور بے حد محفوظ تھی۔ یہ احساس بے حد طمانیت خیز تھا پھر رپورٹرز اور ٹی وی والے کیمرے لئے آپہنچے۔ وہ اسٹیڈیم میں ادھر ادھر بھٹکتے رہے......... ایک باوردی پولیس مین سے دوسرے تک......... سنسنی خیز معلومات کے حصول کے لئے۔ ان کے ایک پولیس والے سے دوسرے تک بھٹکنے سے ثابت ہوتا تھا کہ ان کی تسلی نہیں ہو پارہی ہے پھر وہ اسٹیڈیم کے سرے پر پہنچتے اور کارنر سے جھانک کر دیکھتے جیسے عمارت کی دیواروں پر لکھی ہوئی کوئی خبر پڑھنا چاہ رہے ہوں۔ وہ کمرہ نمبر۲۱ کی طرف اشارہ کرتے اور اپنے کیمرے بندوقوں کی طرح اس پر تانتے لیکن وہاں تصویر کھینچنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ کہیں کوئی مسلح آدمی نظر نہیں آرہا تھا' نہ کوئی فائر کیا گیا تھا۔ نہ ہی کھڑکی سے کوئی جھانکتا ہوا کوئی طالب علم خود کو اور اپنے ہم جماعتوں کو بچانے کی اپیل کررہا تھا۔ وہاں سبھی کو کسی نہ کسی چیز کی تلاش تھی۔ بابر کو اپنے خواب کی تعبیر کی تلاش تھی۔ اخبار اور ٹی وی والے سنسنی خیز خبر کی تلاش میں تھے اور نذیر......... وہ دولت کی تلاش میں تھا۔ تاکہ اپنے اور اس کے لئے ایک پُرآسائش گھر بناسکے۔ شہناز جانتی تھی کہ نذیر کے شہلا سے بھی تعلقات ہیں لیکن اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ رقابت محسوس کرنے کا حق تو وہ اسی دن گنوا چکی تھی جس دن اسے لوٹا گیا تھا۔ اس کے لئے بس یہ یقین ہی کافی تھا کہ نذیر شادی صرف اس سے ہی کرے گا۔ اس نے خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور دو طرفہ ریڈیو اٹھا کر بابر کو کال کیا۔

چند لمحوں کے بعد ریڈیو پر بابر کی آواز ابھری۔ ”کیا بات ہے؟ کوئی گڑبڑ ہورہی ہے کیا؟“

”نہیں' اسٹیڈیم کی چھت پر نشانچی موجود ہیں۔ میں نے سوچا' تمہیں بتادوں۔“

”اس کی تو مجھے توقع تھی۔ عمارت کی طرف دیکھو۔ وہاں تو پولیس والے نہیں ہیں؟“

”نہیں۔ کم از کم اس زاویے سے تو نظر نہیں آرہے۔ سڑک سنسان پڑی ہے۔ میرا خیال ہے پولیس نے ناکہ بندی کردی ہے۔“ شہناز نے کہا پھر اچانک ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔ ”سنو بابر......... اگر وہ یہاں آئیں......... عمارت خالی کرانے کے لئے تو

میں کیا کروں؟"

"دستک کا جواب نہ دینا اور کھڑکی سے دور رہنا تاکہ دیکھی نہ جاسکو۔"

"ٹھیک ہے بابر۔"

"میں چاہتا ہوں کہ اب تم کچھ دیر کے لئے سوجاؤ۔ ریڈیو کھلا چھوڑ دینا تاکہ ضرورت پڑنے پر میں تمہیں جگا سکوں۔ آج رات آزمائش کی رات ہو گی۔ تمہیں آج رات بھر جاگنا اور نائٹ اسکوپ سے اس پورے علاقے کو ٹٹولنا' چیک کرنا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے بابر۔"

"اور کوئی بات؟"

"نذیر موجود ہے؟"

"ابھی کمرے میں آیا ہے۔ اس سے بات کراتا ہوں۔"

اگلے ہی لمحے ریڈیو پر نذیر کی آواز ابھری۔ "کیا بات ہے؟"

"بس تم سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ تنہائی سے پریشان ہوں۔"

"فکر نہ کرو۔ جلد ہی دور ہو جائے گی تنہائی" نذیر نے کہا اور ریڈیو آف کر دیا۔

اس گفتگو کے بعد بابر نے نذیر سے کہا کہ وہ جاکر تمام کھڑکیوں کے پردے برابر کردے "میں نہیں چاہتا کہ اسٹیڈیم کی چھت پر موجود نشانچیوں کو ہمیں چلتے پھرتے دیکھ کر' کھلی کھڑکیوں کے سامنے سے گزرتے دیکھ کر کوئی ترغیب پریشان کرے" اس نے کہا۔

نذیر کو بے وقوف ہونے کا احساس ہونے لگا۔ تمام کام اسی سے لئے جا رہے تھے۔ بابر خود حکم دینے کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہا تھا لیکن اس کام کے پیچھے جو بابر کی منطق تھی' وہ نذیر کی سمجھ میں آنے والی تھی۔ بابر کا ان نشانچیوں کے سامنے ایکسپوز ہونا مناسب نہیں تھا۔ اگر بابر ان کا نشانہ بن گیا تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کیا ہوگا؟ خواب تو بکھر جائے اور وہ لوگ بس اپنی بقا کی جدوجہد کرتے نظر آئیں گے اور صورت حال پوری طرح ا کے خلاف ہو گی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ نذیر کلاس روم میں گھسے اور ایک ایک کر کے طلبا کو قتل کرنا شروع کر دے۔ نہ ہی وہ مشکور کو ایسا کوئی حکم دے سکتا تھا۔ اس بات احساس ہوتے ہی کہ بابر کی بقا ان سب کے لئے کتنی ضروری ہے' نذیر خاموشی سے

اور اس نے ہر کمرے میں جاکر کھڑکیوں کے پردے برابر کر دیئے۔ اس کام سے نمٹ کر اس نے کلاس روم کا رخ کیا۔ وہ یرغمالیوں کو تنہا چھوڑ کر بابر کی طرح مطمئن نہیں رہ سکتا تھا۔ اپنے اندر کہیں گہرائی میں وہ جانتا تھا کہ ہر شخص کے اندر بھڑک جانے کی' متشدد ہوجانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ کیسا ہی شخص ہو' کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو' اسے تشدد کی طرف دھکیلا جاسکتا ہے۔ یہ بات بابر بھی جانتا تھا اور وہ اسے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا تھا مگر اس کے لئے وہ انسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ خود تشدد کرتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ حد سے زیادہ تشدد' نشانہ بننے والے کو اپنے درست اور دوسرے کے غلط ہونے کا شدت سے احساس دلاتا.......... اور اس کے اندر تشدد کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو تشدد ہنسی خوشی سہہ لیتے ہیں.......... اف بھی نہیں کرتے' انہیں یہ اطمینان ہوتا ہے کہ اگر زندہ رہے تو ہر ظلم کا بدلہ لیں گے۔ ان لوگوں کی نفسیات ایک ایسے اخلاقی ضابطے کے تحت کام کرتی ہے' جسے بابر سمجھنے سے قاصر تھا۔

نذیر اپنی سوچوں پر خود ہی حیران رہ گیا۔ وہ حق وانصاف کے حق میں دلائل دے رہا تھا اور دوسری طرف جرم کی دلدل میں خود کو دھنساتا چلا جا رہا تھا لیکن اس کے لئے یہ مسئلہ آئیڈیلز کا نہیں تھا.......... بلکہ بنیادی ضرورت کا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ غربت دنیا کی سب سے بڑی سزا ہے۔ وہ صحیح راستے پر چل کر مادی خوشحالی حاصل کرنے کا موازنہ غلط راستے پر چل کر دولت کمانے سے کرتا تھا۔ اس کے بعد راستے کا انتخاب ہرگز کوئی مسئلہ نہیں رہتا تھا۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ کلاس روم میں داخل ہوا۔

صوفیہ نے جو طلباء اور طالبات کے درمیان فرش پر بیٹھی تھی' چھوٹتے ہی پوچھا "ہمیں کچھ کھانے کو بھی ملے گا' ہم بھوکے ہیں۔"

نذیر کو نہ جانے کیوں صوفیہ سے چڑ محسوس ہوتی تھی' اس کا ردعمل فوری تھا "مجھے معلوم نہیں۔ میری بلا سے' بھوکے مرجاؤ تم لوگ۔"

"ہمیں کھانا چاہئے۔" صوفیہ نے برہمی سے کہا۔

نذیر نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ جوان تھی لیکن اس کے نقوش اور انداز سے

سختی جھلکتی تھی۔ وہ ایسی عورت تھی جو اس پر کبھی التفات نہیں کر سکتی تھی۔ نذیر کو اس بات کی پرواہ بھی نہیں تھی لیکن اس کی ناپسندیدگی نذیر کو بے انصافی کا احساس دلاتی تھی اور عمر بھر اس کے ساتھ یہی بے انصافی ہوتی رہی تھی۔ ”میں تو تم لوگوں کے کھانے کے لئے ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کروں گا۔“

اس بار کمال نے مداخلت کی ”اسٹور روم میں کینڈی اور پاپ کورن موجود ہیں۔ ہم اس سے ہی کام چلالیں گے۔“

نذیر نے بے رحمی سے قہقہہ لگایا ”اپنے ہی ذرائع استعمال کرو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے.........“

وہ بہت گھٹیا بات تھی۔ اگرچہ کلاس کے بیشتر طلباء کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کمال کو غصہ تو بہت آیا تاہم اس نے تحمل سے کہا ”لگتا ہے‘ تم یہ تجربہ کر چکے ہو لیکن یہ کام ہمارے بس کا نہیں۔“

نذیر میز پر چڑھ کر بیٹھ گیا ”کیوں نہیں۔ جبکہ مجھ جیسے کروڑوں غریبوں کو کسی کی پروا نہیں ہوتی۔“

”بات سنو۔ یہ بچے پہلے ہی کچھ کم پریشان نہیں ہیں۔ ان کی پریشانیوں میں اضافہ نہ کرو۔“

نذیر کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ شعوری طور پر اس تمتماہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمال فرش سے اٹھا اور ایک ڈیسک پر ٹک گیا ”ایسا کرو۔ اپنے باس سے پوچھ آؤ۔“

نذیر سفاکی سے ہنسنے لگا ”یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے اور میرا جواب انکار میں ہے۔ اسے ایک طرح کا سبق سمجھ لو ماسٹر‘ عیش و عشرت کی زندگی نے تمہیں کس حال کو پہنچا دیا ہے۔ تم ایک وقت بھوکے نہیں رہ سکتے۔ جبکہ لاکھوں انسان ایسے ہیں‘ جنہیں ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے میسر آتی ہے۔ تمہیں ڈٹ کر کھانا کھاتے وقت کبھی ان لوگوں کا خیال بھی آتا ہے؟“

”میں سمجھ گیا۔ تم کہانیوں والے سلطانہ ڈاکو ہو۔ امیروں سے دولت چھین کر غریبوں میں بانٹو گے۔ بہت اچھا آئیڈیا ہے“ کمال نے کہا ”اور متوسط طبقہ بھوکا مرتا رہے

گا‘ بہت خوب۔“

نذیر اچھل کر میز سے اترا اور جارحانہ انداز میں کمال کی طرف بڑھا۔ اس کی انگلی کمال کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور وہ عملاً چیخ رہا تھا ”اس لئے کہ تم جیسے لوگ ہم لوگوں کو دیانت داری سے نہیں جینے دیتے.........“

رئیس کی آواز نے مداخلت کی ”ان پر غصہ نہ کرو مسٹر۔ یہ تو قابل رحم حد تک سیدھے سادے آدمی ہیں۔“

نذیر رک گیا ور اس نے دلچسپی سے بڑے بالوں والے لڑکے کو دیکھا ”کیا مطلب؟“

”یہ بے چارے تو سسٹم کا ایک حصہ ہیں۔“

”اچھا؟ یعنی یہی تعلیم دی جا رہی ہے تمہیں؟“ نذیر نے دلچسپی سے پوچھا۔

”بالکل۔ جب سے ہوش سنبھلا ہے‘ یہی سن رہا ہوں۔ اچھے بنو‘ جیسا میں کہتا ہوں‘ ویسا کرو۔ سیدھے راستے پر چلو۔ کامیاب انسان بنو گے“ رئیس نے نقل اتارتے ہوئے کہا۔

نذیر میز کی طرف واپس چلا گیا ”تم اس کی بات پر عمل کرو۔ تم کامیاب انسان بن سکتے ہو۔“

”رئیس‘ تم اس معاملے میں مت پڑو۔“ کمال نے تہدیدی لہجے میں کہا۔

”کیا بات ہے ماسٹر۔ بچوں کا بولنا اچھا نہیں لگا تمہیں؟ یا سچ سننا برا لگتا ہے؟“ نذیر نے طنز کیا۔

کمال نے ڈیسک پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا ”نہیں......... لیکن میں انہیں نظریاتی طور پر برباد ہونے دینا نہیں چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے طلباء خود کو کچلی ہوئی اکثریت تصور کر کے تمہاری طرح خود ترسی میں مبتلا ہوں......... اور رئیس کی بات اور ہے‘ اس کے لئے یہ باتیں کرنا محض فیشن ہے۔“ وہ کہتے کہتے رہ گیا۔ یہ بتانا بہت مخدوش بلکہ تباہ کن تھا کہ رئیس نہ صرف پچاس لاکھ کے بنگلے میں رہتا ہے بلکہ اس کا باپ وزیر داخلہ ہے......... وفاقی وزیر.........

لیکن رئیس پر تو کمال کا اختیار نہیں تھا۔ "میرے والد مرکزی حکومت میں وزیر داخلہ ہیں لیکن میں ان سے بھی اختلافات رکھتا ہوں۔" رئیس نے فخریہ لہجے میں کہا "یہ فیشن کی بات نہیں۔"

"رئیس- غیر ضروری باتیں مت کرو۔" کمال نے کہنا چاہا۔

"یہ تو بڑے کام کی بات معلوم ہوئی ہے" نذیر نے اس کی بات کاٹ دی" اور تم بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہو۔ میں ابھی تمہارے طلباء کو عملی مظاہر کر کے دکھاتا ہوں کہ قوت کے استعمال سے سسٹم کو کیسے سیدھا کیا جاسکتا ہے۔ یہاں آؤ کمال صاحب!" اس نے رائفل لہرا کر اسے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

کمال ڈیسک سے اتر کر اس کی طرف بڑھا "کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم میرے سامنے گھٹنوں کے بل جھکو۔"

کمال سوچ میں پڑ گیا۔ وہ علامتی فرمائش تھی...... سسٹم کو اپنے قدموں میں جھکانے کی اور کمال جانتا تھا کہ سسٹم میں خرابیاں سہی لیکن پھر بھی وہ سسٹم نہ ہونے سے بہتر ہے۔ خرابیاں تو دور کی جاسکتی ہیں لیکن سسٹم کا نہ ہونا طوائف الملوکی اور بالآخر ملک اور معاشرے کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ اس نے تمام امکانات کو تولا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے تو ہر صورت میں نقصان پہنچنا ہے۔ جھکے گا تو کمزور ثابت ہوگا۔ نہیں جھکے گا تو ذلت اور توہین کا ہدف بنے گا۔ اس نے بڑے تحمل سے کہا "نہیں...... یہ ممکن نہیں۔"

"سن رہے ہو وزیر زادے۔ کیا نام ہے تمہارا...... ہاں رئیس" نذیر نے کہا اور رائفل کی نال کمال کے سینے پر رکھ دی۔ "جھکو۔" وہ غرایا۔

"نہیں۔"

"نہیں جھکو گے تو میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔" نذیر نے دھمکی دی۔ اسے اپنی گدی کے اندر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"نہیں۔"

"وزیر زادے، رئیس، اب اپنے استاد کا حشر بھی دیکھنا۔ اب تمہیں پتا چل جائے گا کہ کتابی باتیں اور ہوتی ہیں اور عملی باتیں اور" نذیر نے رئیس سے کہا پھر وہ کمال کی

طرف مڑا "سنو ماسٹر، بہتری اسی میں ہے کہ جھک جاؤ۔"

"نہیں" کمال کے لہجے میں اب بھی تحمل تھا۔

نذیر کا دل چاہ رہا تھا کہ ٹریگر دبا دے۔ زندگی میں پہلی بار اس کے اندر شعوری طور پر کسی کو قتل کرنے کی خواہش ابھری تھی۔ خاص طور پر اس شخص کو قتل کرنے کی خواہش۔ یہ شخص اس کے لئے نفرت انگیز تھا۔ وہ متوسط طبقے کا خوش حال آدمی تھا۔ دوسروں کا احساس نہ کرنے والا۔ اس کے اندر ہر وہ خصوصیت تھی، جس سے نذیر کو نفرت تھی۔ نذیر آگے کی طرف جھکا اور اس نے رائفل کی نال کمال کے سینے پر رکھ کر اسے پوری قوت سے دھکیلا۔ اس ایک لمحے میں جب دونوں کے جسم غیر متوازن تھے۔ کمال نے ہاتھ بڑھا کر رائفل کی نال پکڑ لی اور اسے کھینچا۔ نذیر نے رائفل چھڑانے کے لئے جھٹکا دیا۔ اس چکر میں ٹریگر دب گیا، گولی چلی، کمال گھوما اور ایک جھٹکے سے ایک ڈیسک پر جا کر گرا۔ فائر کی آواز نے پوری کلاس میں سکتہ طاری کردیا۔

خود نذیر کا بھی یہی حال تھا۔ دیوانگی کی سرخ لہریں اس کے وجود میں مچل رہی تھیں لیکن دھماکے نے اسے ہوش میں رہنے پر مجبور کردیا۔ وہ نیچے گرے ہوئے کمال کا جسم گولیوں سے چھلنی کر دینا چاہتا تھا لیکن کوئی چیز اسے روک رہی تھی۔ وہ قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بس اس شخص کو ایذا پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ اسے انتہا درجے کی اذیت سے دوچار کرنا چاہتا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر مشکور کو آوازیں دیے جا رہا تھا۔ اچانک اس نے پلٹ کر دیکھا تو پتا چلا کہ وہ سب اس کے پیچھے کھڑے ہیں۔

بابر نے منہ سے کچھ نہیں کہا بس اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ مشکور نے مستفسرانہ نگاہوں سے بابر کو دیکھا۔ بابر نے سر کو تائیدی جنبش دی۔ مشکور آگے بڑھا اور اس نے بڑی آسانی سے کمال کو فرش سے اٹھا دیا۔ کمال کی قمیض بائیں کندھے کے پاس سے سیاہ ہو رہی تھی اور جس جگہ بازو کندھے سے ملتا ہے، وہاں چھوٹا سا ایک خلا تھا، جس سے ادھڑے ہوئے عضلات نظر آرہے تھے اور خون بہہ رہا تھا۔

"اسے جھکاؤ۔" نذیر غرایا۔

کمال لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ اس تے سہارے کے لئے مشکور کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ نفی میں

سر ہلا رہا تھا۔ اسے گرنے سے بچانے کے لئے مشکور نے اسے پکڑا ہوا تھا۔

"مشکور.......... اسے مارو' اذیت دو۔"

"تم یہ کام پہلے ہی کر چکے ہو۔ اب یا اسے ختم کرو' یا اس کا پیچھا چھوڑو۔"

بابر کی نگاہوں میں عجیب سا تاثر تھا۔ وہ سحر زدہ سا کمال کو دیکھ رہا تھا۔ "ا مارو۔" وہ بڑبڑایا۔

"ٹھیک ہے' تم کہتے ہو تو یہی سہی" مشکور نے کہا' پھر اس نے قمیض کا کالر تھام کمال کو اوپر اٹھایا اور پوری قوت سے اس کے پیٹ میں گھونسا مارا۔ اس کے نتیجے کمال کا پورا بوجھ اس پر آ پڑا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ کمال نے ہاتھ پا چلائے۔ مشکور کے منہ پر جھپٹا مارا.......... اور اب وہ اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔

"گھٹنوں کے بل جھک جا.........." نذیر گالی دیتے ہوئے چلایا۔

"خدا کے لئے کمال.......... جھک جاؤ" صوفیہ کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہ تھی۔

"نہیں۔"

بابر تیزی سے کمال اور مشکور کے درمیان آ گیا۔ "جھک جاؤ۔ ورنہ میں مشکور کہوں گا کہ تمہیں ختم کر دے" وہ رد عمل کے لئے کمال کے چہرے کو بہت غور سے د رہا تھا۔

"نہیں۔"

بابر پیچھے ہٹتے ہوئے اس شخص کو دیکھ رہا تھا' جو مشکور کے بازوؤں میں بے جان ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سے اندازے کی کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے بہرحال اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس شخص کو توڑنے کے لئے اس کے پاس بہت وقت تھا۔ وقت کی کوئی کمی نہیں تھی "تم اتنی مزاحمت کیوں کر رہے ہو؟"

"سسٹم افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا یہ خیال غلط ہے کہ اسے جھکایا جا سکتا ہے" کمال نے ڈوبتی ابھری آواز میں جواب دیا۔

"مجھے حیرت ہے تم پر۔ تم ذہین ہو' پڑھے لکھے ہو' جانتے ہو کہ تشدد ایک ا

ہتھیار ہے جس سے کسی بھی سسٹم کو' کسی بھی معاشرے کو اور کسی بھی فرد کو با آسانی تباہ کیا جا سکتا ہے۔" بابر نے کہا پھر وہ مشکور کی طرف مڑا "اسے اور مارو مشکور۔"

مشکور' کمال کو قمیض سے تھام کر گھسیٹتا ہوا دیوار کی طرف لے گیا۔ اسے دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے اس نے پوری قوت سے ایک گھونسا اس کے چہرے پر اور دو گھونسے اس کے پیٹ میں مارے۔ کمال دہرا ہو گیا۔ مشکور نے گھٹنا اس کے سینے پر مارا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کام کیسے کرے۔ اسے کمال کو سنبھالنا اور کھڑا کرنا بھی تھا اور اسے مارنا بھی تھا۔ اس نے کمال کو چھوڑ دیا' جو نیچے فرش پر ڈھیر ہو گیا "اور ماروں؟" اس نے بابر سے پوچھا۔

بابر نے سوالیہ نظروں سے نذیر کو دیکھا "یہ تو جھکنے کو تیار نہیں ہے اور پٹواؤں؟"

نذیر' کمال کی طرف بڑھا۔ کمال کو سانس لینے کے لئے بھی جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ اپنی کراہوں پر بھی اس کا اختیار نہیں تھا۔ نذیر کو اب خود بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ ماسٹر سے کیا چاہتا تھا۔ وہ اسے سسکتے' گڑگڑاتے' زندگی کی بھیک مانگتے دیکھنا چاہتا تھا۔ یا اسے اپنی توہین' اپنی ذلتوں اور اپنے دکھوں اور پریشانیوں میں شریک کرنا چاہتا تھا؟ اس کی خواہش جو بھی رہی ہو' بہرحال پوری نہیں ہوئی تھی۔ ماسٹر کو گولی بھی لگی تھی اور اس کی مرمت بھی ہوئی تھی۔ وہ موت سے صرف ایک ثانیے کے فاصلے پر تھا لیکن زندگی اب بھی اس کے لئے اپنے برحق ہونے کے احساس سے زیادہ قیمتی نہیں تھی۔ اس پر تشدد ہوا تھا لیکن وہ اپنے درست اور برحق ہونے کے تصور میں مست و سرشار اور یوں محفوظ و مامون تھا۔

نذیر نے اسے ٹھوکر ماری اور کہا "نہیں.......... یہ کافی بھگت چکا ہے" اس لمحے اسے اپنا آپ بہت برا لگ رہا تھا۔

بابر کمال کے نزدیک گیا اور اس پر جھکتے ہوئے بولا "تم بہت بے وقوف آدمی ہو۔"

کمال اذیت سے بے حال تھا لیکن اس بات کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔ اس نے اپنی زندگی نامعقول سوالوں کے آخری حد تک معقول جواب دینے کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس احمقانہ مگر سفاک صورت حال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور جواب

اسے درکار تھا۔ اس نے دانت بھینچ کر پوچھا "تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟"

بابر کے چہرے کے عضلات نرم پڑ گئے "میں ایک فن کی مشق کر رہا ہوں۔"

"بچوں کو دہشت زدہ کرنے کے؟"

"یہ تو اس فن کی بس ایک شاخ ہے" یہ کہتے ہوئے بابر کے دانت نمایاں ہوئے "تم نہیں سمجھ سکتے۔ جیسے پڑھانا تمہاری جاب ہے' یہ دہشت گردی میری جاب ہے ا میں اتنا طاقت ور ہوں کہ جو چاہوں حاصل کرلوں۔ میں دہشت زدہ بھی کرسکتا ہوں ا قتل بھی کرسکتا ہوں۔ میں اپنی ہر مرضی پوری کرسکتا ہوں۔ مجھے کوئی خوف نہیں ا لئے کہ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ تمہاری اذیت میری مسرت ہے۔ یہی میرا کام ہ میں تمہیں استعمال کرسکتا ہوں اور بعد میں تمہیں بیکار چیز سمجھ کر پھینک بھی سکتا ہو میرے نزدیک کسی چیز کی' کسی انسان کی کوئی وقعت نہیں۔"

بابر نے یہ بات بہت نرم لہجے میں کہی تھی لیکن لفظ ایسے تھے کہ کمال کی تکلی میں اضافہ ہوگیا "لیکن کس لئے؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ یہ گفتگو بس اس کے بابر کے درمیان تھی۔

"اس لئے کہ میری زندگی کا یہی مقصد ہے۔ مجھے اس سے خوشی ملتی ہے۔ مقصد حاصل کرنے کے لئے میں کسی کو بھی کچل سکتا........ روند سکتا ہوں۔"

کمال اس گفتگو سے دستبردار ہونا چاہتا تھا۔ اذیت سے بچنے کے لئے اس اندھی میں چھپ جانا چاہتا تھا' جو اس کی آنکھوں میں چھا رہا تھا لیکن یہ شخص اسے حیران دے رہا تھا۔ انسان ایسے بھی ہوسکتے ہیں؟ "یعنی تم شیطنیت کا روپ ہو۔ تمہارے ع بھی شیطانی ہیں۔"

"نہیں' میں ایک محب وطن آدمی ہوں" بابر نے معنی خیز لہجے میں کہا' پھر اس تیزی سے موضوع بدلا "یہ جنہیں تم بچے کہتے ہو" اس نے کلاس کی طرف اشارہ "اب یہ ہمیشہ دہشت زدہ رہیں گے۔ اس لئے کہ ہر سنسان سڑک پر' ہر تاریک گو میں انہیں زندگی بھر میرا سایہ نظر آتا رہے گا۔ میرے مرجانے کے بعد بھی میری یا کے ذہنوں میں زندہ رہے گی۔"

کمال نے آنکھیں بند کرلیں اور ایک لمحے خاموش لیٹا رہا۔

"کیوں؟ اس کا کوئی جواب ہے تمہارے پاس؟" بابر نے اسے چھیڑا۔

کمال نے آنکھیں بند کئے کئے جواب دیا "تم خود کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہو۔"

بابر نے بڑھ کر اس کے کھلے زخم پر جوتا رکھ کر دباؤ ڈالا۔ کمال تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ "اور تم بکواس بہت زیادہ کرتے ہو" وہ غرایا پھر وہ شہلا کی طرف مڑا "فیکلٹی روم میں فرسٹ ایڈ باکس رکھا ہے۔ وہ لے آؤ' لیڈی ٹیچر ہمارے ہیرو کی مرہم پٹی کردے گی۔ بدقسمتی سے ابھی ہمیں اس کی ضرورت ہے" وہ کونے میں بیٹھے ہوئے طلباء کی طرف گیا اور نازیہ کے سامنے جارکا۔ "یہ ہماری صلاحیتوں اور طاقت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ ہمیں ایسا کوئی موقع نہ دو" اس نے ادھر ادھر دہشت زدہ چہروں کو دیکھا۔ وہ ستائیس نوعمر لڑکے لڑکیوں کے معدوں میں ہونے والی اینٹھن کا تصور کرسکتا تھا۔ اس نے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا پھر اس کی نظریں نازیہ کے معصوم اور حسین چہرے پر آرکیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر مشکور کو اپنے ساتھ لے کر کمرے سے نکل گیا۔

صوفیہ نے شہلا سے فرسٹ ایڈ باکس جھپٹا اور کمال کی طرف لپکی۔ کمال نے اسے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن اس کی حالت ایسی تھی کہ اس پر قابو پانا صوفیہ کے لئے مشکل نہیں تھا۔ اس نے اس کے کندھے کے زخم کا جائزہ لیا۔ گولی جوڑ کے قریب موٹے مسلز کو پھاڑتی ہوئی گزری تھی۔ اسے احساس ہوگیا کہ زخم صاف کرنے اور خون روکنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ پانچ انچ لمبا بدصورت زخم تھا' جس سے ادھڑا ہوا گوشت جھانک رہا تھا۔ اس نے بہت غور کیا لیکن اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر کمال کو فوری طور پر بھی کسی ماہر ترین سرجن کی خدمات حاصل ہوجائیں (جو کہ خارج از امکان تھا) تو بھی شاید اس کا یہ ہاتھ کبھی پہلے کی طرح کام نہیں کرسکے گا۔ اس نے زخم کی صفائی کی اور پٹی کو اینٹی بایوٹک دوا میں بھگو کر زخم پر رکھنے کے بعد اسے خوب کس کر باندھ دیا۔ بینڈیج نے فوراً ہی خون جذب کرنا شروع کردیا۔ یعنی پٹی بار بار بدلنا ضروری تھا پھر ایک طالب علم کی مدد سے اس

نے کمال کو زبردستی اسپرین کی دو ٹکیاں دیں۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ نڈھال سی ہو کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ اس کے رخسار پر پڑے نیل کو اپنی انگلیوں سے بڑی نرمی سے سہلاتی رہی۔ وہ اب بھی ہوش میں تھا لیکن اپنی نگاہوں کو فوکس کرنے کے لئے اسے سخت کوشش کرنی پڑ رہی تھی۔

"پرسکون رہنے کی کوشش کرو" صوفیہ نے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے' میں بہت تکلیف میں ہوں" کمال کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"پھر بھی' ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دو۔ خون رکنا بہت ضروری ہے۔"

کمال نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اس لمحے رئیس آیا اور گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا "سر......... مجھے امید نہیں تھی کہ وہ لوگ اتنا کچھ کر گزریں گے۔" وہ بولا۔

"جاؤ......... چلے جاؤ یہاں سے" کمال نے تند لہجے میں سرگوشی کی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

☆-------------☆-------------☆

بے ہوشی کے اندھیرے میں وہ پھر چھوٹا سا لڑکا بن گیا۔ وہ چھوٹے سے اصطبل میں سیاہ بچھیرے کی باگیں تھامے کھڑا تھا۔ وہ کتنی وسیع و عریض دنیا تھی۔ چالیس ایکڑ زمین......... زرعی' نہری۔ وہ ہر صبح ساڑھے چار بجے بیدار ہوتا تھا۔ اپنے بچھیرے کو چارا دیتا' اس پر سواری کرتا' اس وقت اس کی عمر سات آٹھ سال تھی۔ اتنی طاقت' اتنی توانائی کہاں سے آتی تھی کہ وہ ساڑھے چار بجے اٹھتا۔ اسکول سے واپس آنے کے بعد دن بھر بھوسے کے ڈھیر پر اچھلتا' کودتا اور کھیلتا رہتا۔ خواب کی اس کیفیت میں بھی وہ بھوسے کی خوشبو میں گھلی ملی گوبر کی بو محسوس کر رہا تھا۔ وہ کتنی محفوظ دنیا تھی۔ بیس بھینسیں اور سو سے زائد مرغیاں تھیں ان کے پاس اور گھر کے مکھن کی سی نرمی اور ذائقہ پھر کہیں نہیں تھا۔ وہ دن......... وہ خوب صورت صبحیں کیا ہوئیں......... کہاں گئیں؟ اور بابا؟ ا تنومند' سخت جان اور جفاکش بابا' جنہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے وہ بڑے بڑے کھردرے ہاتھ۔

قید سے رہائی کے بعد وہ واپس آیا تو اپنے سکڑے سمٹے بابا کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی قید کے دکھ نے بابا کو اندر سے چاٹ لیا ہے۔ وہ اس رات اپنے بستر پر لیٹ کر چپکے چپکے روتا رہا تھا۔ اس لئے کہ پتھر کا مضبوط آدمی ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ اس کے وجود میں دراڑیں پڑ گئی تھیں اور پھر دو سال بعد سب کچھ جل گیا تھا۔ پورے گاؤں کو معلوم تھا کہ وہ کن لوگوں کی حرکت ہے لیکن قانون کو نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ اس نے پولیس کو بتایا تھا لیکن مجرموں کے سیاسی ہاتھ بہت لمبے تھے۔ پولیس ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی۔ لہٰذا تجاہل عارفانہ سے کام لیتی رہی اور وہ خود......... وہ انتقام لینے کی طاقت اور ہمت رکھتا تھا لیکن وہ خود فوجی تھا۔ وہ صرف غیر ملکی دشمنوں کے خلاف ہتھیار اٹھا سکتا تھا۔ اسے یہی تربیت دی گئی تھی۔ سو وہ انتقام سے دستبردار ہو گیا۔

☆-------------☆-------------☆

اس کے پیٹ سے متلی کا احساس ایک تند لہر کی صورت اٹھا اور اس کے حلق تک ابل آیا۔ اس احساس نے اسے بے ہوشی کی اندھیری عافیت گاہ سے اٹھا دیا۔ وہ اتنی جگہ سے دکھ رہا تھا کہ کسی ایک مقام اذیت کی بھی نشان دہی نہیں کر سکتا تھا۔ گہرائی میں دھڑکتا لرزتا درد اس کی گردن سے پھیلتا پھیلتا' اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں تک آ پہنچا تھا۔ اس نے حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن عضلات کا ہلکا سا کھنچاؤ بھی متلی کے احساس کو بہت زیادہ بڑھا دیتا تھا۔ وہ کروٹ بدلنا......... اٹھنا چاہتا تھا لیکن یہ ناممکن تھا۔ وہ ٹھنڈے فرش پر آنکھیں بند کئے لیٹا اپنی پیشانی پر پسینہ پھوٹتے محسوس کرتا رہا۔ پسینہ بہہ کر اس کی کنپٹی تک آ رہا تھا۔ کان کے نیچے سے گزر کر گردن پر ٹپک رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ خون کی کمی کو وہ محسوس کر رہا تھا۔ ٹھنڈک کا احساس اس کی جلد کے پار اتر کر جسم میں پھیل رہا تھا۔ اسے اپنا جسم تیرتا اور جھولتا محسوس ہو رہا تھا......... اور وہ جسم کی حرکات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کافی دیر کے بعد اسے آنکھیں کھولنے کی ہمت ہو سکی۔ آنکھیں کھلیں تو اسے دھندلاہٹ کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ نظریں فوکس کرنے کی کوشش میں متلی کا احساس پھر ابھر آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا پھر صوفیہ کا چہرہ اس پر جھک آیا "کیسا

محسوس کر رہے ہو؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"بہت خراب۔"

"تمہاری حالت اچھی نہیں لگتی۔ کندھے کا کیا حال ہے؟"

"بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ یہ اندھیرا کیوں ہے؟"

"تم بہت دیر بے ہوش رہے ہو۔"

"کیا وقت ہوا ہے؟"

"میرا خیال ہے' رات کے بارہ بج چکے ہیں۔"

"کوئی خاص بات؟"

"نہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً ہمیں چیک کرنے کے لئے آتے رہے ہیں۔ وہ جسے وہ بار نام سے پکارتے ہیں' دو بار آ چکا ہے۔ وہ نازیہ کو جن نظروں سے دیکھتا ہے' مجھے بہت لگتا ہے۔"

"اب وہ کیا کر رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے' باری باری نیند لے رہے ہیں۔"

کمال نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس پر بے پناہ تھکن غالب آ رہی تھی۔ اور کی طرح مسلسل دھڑکتے درد کی طرف سے اپنے ذہن کو بند کر لینا چاہتا تھا۔ بہت کوش کر کے اس نے آنکھیں کھولیں۔ "بچوں کا کیا حال ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تم نے انہیں بری طرح ڈرا دیا۔ میں دو گھنٹے کی کوشش کے بعد انہیں دوبا پُرسکون کر سکی ہوں۔ اس وقت میرے خیال میں ان میں سے بیشتر سو رہے ہیں۔"

"میں تو انہیں صبر و تحمل کے لیکچر بھی نہیں دے سکتا۔"

"تم نے احمقانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا ثابت چاہ رہے تھے؟"

"میں خود بھی نہیں سمجھا۔ شاید عزتِ نفس کی بات تھی۔ حالانکہ بھارت کے قیدیوں کے کیمپ میں وہ لٹ چکی تھی۔"

"پتا ہے' تم مر بھی سکتے تھے۔"

کمال سوچ رہا تھا۔ واقعی ان لوگوں نے اس سے کوئی بڑا مطالبہ تو نہیں کیا تھا۔ تو اسے وہ اتنا بڑا کیوں لگا تھا۔ کیا اس لئے کہ وہ صوفیہ کے اور اپنے اسٹوڈنٹس کے سامنے ذلیل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کیا وجہ تھی۔ گھٹنوں کے بل جھکنا اتنی بڑی بات تو نہیں تھی کہ اس کے لئے آدمی مرنا گوارہ کر لے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حوصلہ اور بدمزگی کا وہ شدید احساس کہاں سے ابھرا تھا' جس نے اسے نذیر کی رائفل پر ہاتھ ڈالنے پر اکسایا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ اس سے رائفل چھین کر اس صورت حال کو ختم کر دینا چاہتا تھا' جس نے اسے مضطرب کر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے جنگی قیدیوں کے کیمپ کی ناخوش گوار یادیں ابھر آئی تھیں اور اسے اپنا آپ برا لگنے لگا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ رائفل چھیننے کے بعد وہ کیا کرتا۔ نذیر کو ختم کر دیتا۔ کیا وہ اتنی آسانی سے اپنے نظریات' اپنی اہلیت بھول سکتا ہے۔ اس نے تو ذاتی انتقام کی شدید خواہش کو ان نظریات اور تربیت پر قربان کر دیا تھا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ میدان جنگ کے سوا وہ کبھی انسانی زندگی کو موت کے گھاٹ نہیں اتارے گا مگر اور کوئی صورت بھی تو نہیں تھی۔

"میرا خیال ہے' اب ہمیں منصوبہ بندی شروع کر دینی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ صورت حال ہمارے ہاتھوں سے بالکل ہی نکل جائے" اس نے صوفیہ سے کہا۔

"مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"ہمیں ان بچوں کو باہر نکالنا ہے" کمال نے کہا اور اندھیرے میں جانے پہچانے کمرے کو نظروں سے ٹٹولا۔ ہر منزل پر کونے والے کلاس روم میں دو ایسی دیواریں تھیں' جن میں کھڑکیاں تھیں۔ عام کمروں میں ایسی ایک ہی دیوار تھی۔ یہ سوچتے ہوئے کمال کو اچانک احساس ہوا کہ یہ کلاس روم کس حد تک اس کی زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ وہ اس کمرے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ سرخ ٹائلوں والے فرش میں کہاں کہاں رخنے ہیں' وہ جانتا تھا۔ چھت پر موجود ہر داغ دھبے سے وہ واقف تھا۔ اس کی پوری زندگی اپنی تمام اہمیتوں سمیت اس کمرے سے وابستہ ہو گئی تھی۔ یہاں سے اسے خوشیاں زیادہ اور مایوسیاں کم ملی تھیں۔ ان طلباء کی تعداد بھی یاد نہیں تھی' جنہیں اب تک وہ پڑھا چکا تھا۔ وہ یہ حساب نہیں لگا سکتا تھا کہ ان طلباء اور طالبات نے اس کی زندگی پر کیسے

نقوش چھوڑے ہیں۔ یا اس نے ان کی زندگی پر کیسے نقوش چھوڑے ہوں گے۔ اس کے لئے وہ کلاس روم ایک شاندار تجربہ تھا لیکن آدمی ہوتا ہی ناشکرا ہے۔ شاید وہ جنت میں بھی خوش نہ رہ سکے۔ اس کلاس روم نے اسے اتنا کچھ دیا تھا لیکن وہ اسے اپنے لئے بہت بڑا بوجھ سمجھتا تھا۔ اس نے طلباء کو نہ صرف اچھی طرح پڑھایا تھا بلکہ خود بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔ اس کی بالغ نظری میں اضافہ ہوا تھا۔ اس کا انسانوں کو سمجھنے کا علم آگے بڑھا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ اسے اس کمرے سے محبت ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کی خوش گوار یادیں خون آلود ہوں اور وہ بھی اس کے شاگردوں کے خون سے۔ وہ انہیں جلد از جلد اس کمرے سے نکال دینا چاہتا تھا' جو کسی بھی وقت مقتل بن سکتا تھا۔

"میرے خیال میں سب سے پہلے نازیہ' رئیس' اور نعمان کو باہر نکالنا ہوگا" اس نے کہا "نازیہ کو اور طرح کا خطرہ ہے۔ وہ بابر اسے خراب نظروں سے دیکھتا ہے۔ رئیس کے متعلق اسے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ وزیر کا بیٹا ہے۔ وہ اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا ہے اور نعمان کے متعلق اگر اسے معلوم ہو گیا کہ وہ ایس پی کا بیٹا ہے تو اور مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔"

"مگر کیسے؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"اگر عقبی کھڑکیوں سے دو لڑکوں کو کسی طرح آگ سے بچاؤ والے چکر دار زینوں پر اتار دیا جائے تو وہ دوسروں کی مدد کر سکیں گے۔"

اسی وقت فرش پر سمٹ کر سوتے ہوئے بچوں کے درمیان ایک سایہ متحرک ہوا اور ان کی طرف بڑھا۔ وہ خاموش ہو گئے۔ وہ نازیہ تھی۔ اسے کمال دور سے بھی پہچان سکتا تھا۔

"کیا بات ہے نازیہ!" اس نے پوچھا۔

"سر آپ تو ٹھیک ہیں نا؟"

کمال نے مسکرانے کی کوشش کی "میں ٹھیک ہوں۔ تم واپس جاؤ اور سونے کی کوشش کرو۔"

"سر.......... مجھے باتھ روم جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے ذرا باہر کا حال بھی دیکھتی آنا۔"

نازیہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اچانک صوفیہ نے کہا "اس کا اکیلے باہر جانا مناسب تو نہیں۔"

کمال جانتا تھا کہ وہ اٹھ کر نازیہ کے ساتھ جانے کے قابل نہیں ہے۔ صوفیہ کو ساتھ بھیجنا بھی مناسب نہیں تھا۔ "کوئی حرج نہیں" اس لمحے اس کی طبیعت پھر بگڑنے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اٹھ کر بچوں کو باہر نکالنے کا بندوبست کرنا چاہئے۔ سردی بھی خاصی ہو رہی تھی۔ اور وہ فرش پر پڑے تھے لیکن اس لمحے وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا ذہن ڈوبتا جا رہا تھا اور اس کیفیت سے لڑنا اس کے لئے آسان نہیں تھا۔ صوفیہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن اس کی آواز آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ نیند سے نہیں لڑ سکے گا۔

"ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا" وہ بڑبڑایا مگر اسے یقین نہیں تھا کہ اس کی آواز صوفیہ تک پہنچی ہوگی۔

اس کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ اندر گہرا سناٹا تھا مگر وہ سناٹا بھی یوں چیخ رہا تھا کہ اس کی سماعت معطل ہو گئی تھی۔ جیسے دور ہوا غراتی ہوئی چل رہی ہو۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ سن نہیں پا رہا تھا۔ بس بھنبھناہٹ سی کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا گیا۔ جاگتے رہنے کی جدوجہد دم توڑتی گئی۔ وہ بھول گیا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ شعور میں کوئی اہم بات تھی' جسے وہ گرفت میں نہیں لے پایا تھا۔

ذرا دیر بعد صوفیہ نے اسے نرمی سے ہلایا "کمال.......... کمال سنو۔ نازیہ کو گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی ہے اور وہ واپس نہیں آئی۔ مجھے تو اب پریشانی ہو رہی ہے۔"

"کتنی دیر ہو گئی؟" کمال نے بہت کوشش کر کے پوچھا۔ بولنا بھی اس کے لئے بہت بھاری کام ہو گیا تھا۔

"آدھا گھنٹا ہو گیا ہو گا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟ میں تمہیں جگانا بھی نہیں چاہتی تھی۔"

کمال نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے جسم میں ہر طرف اذیت کی لہر دوڑ گئی جیسے تیسے وہ اٹھ بیٹھا مگر اس کی پیشانی پسینے میں تر ہو گئی تھی۔ متلی کے احساس سے لڑ ہوئے وہ دیوار کا سہارا لے کر اپنے قدموں پر اٹھا۔ ذرا قدم جمے تو وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ "میں آگے نہیں جا سکوں گا" اس نے صوفیہ سے کہا "تم جا کر دیکھو۔ میں یہاں کھ ہوں۔"

صوفیہ نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور راہداری میں نکلی۔ راہداری کے اس سرے پر اسے مشکور بیٹھا نظر آیا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ صوفیہ نے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کمال دروازے میں کھڑا اسے دیکھ رہا۔ صوفیہ باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ کمال کو توقع تھی کہ وہ چند لمحوں میں واپس جائے گی۔ دیر لگی تو اسے تشویش ہونے لگی۔ لمحے گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ طبیعت رہ رہ کر بگڑ رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہیں فرش پر لیٹ جاتا۔ پسینے نے اب اس کی قمیض کا کالر بھگو دیا تھا۔

عین اس وقت جب اس کی برداشت جواب دے رہی تھی اور وہ فرش پر لیٹنے ہی والا تھا کہ دروازہ کھلا اور صوفیہ نازیہ کو سہارا دے کر باہر لائی۔ کمال کا دل ڈوبنے لگا۔ یقیناً کوئی گڑبڑ تھی۔ اس لئے کہ نازیہ کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ صوفیہ، نازیہ کو کمرے میں لائی اور اسے ڈیسک سے ٹکا کر بٹھا دیا۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" کمال نے کمزور آواز میں پوچھا۔

صوفیہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے "اس درندے نے درندگی کی حد کر دی" اس نے بمشکل کہا۔

کمال کے اندھیروں میں گھرے ذہن کو بات سمجھنے میں خاصی دیر لگی اور جب بات اس کی سمجھ میں آئی تو اس کے وجود میں دھماکے ہونے لگے وہ پلٹ کر اندھا دھند دروازے کی طرف بڑھا۔ پہلے وہ ایک اور پھر دوسری ڈیسک سے ٹکرایا۔ اس نے سامنے والی دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔ پسینہ اب اس کے چہرے سے پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ پسینے نے اس کی آنکھوں کو کچھ دیکھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ دیوار کا

سہارا لے کر آگے بڑھتے ہوئے اس نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی لیکن اس کے جسم کا پورا بوجھ دروازے پر جا پڑا۔ اس کا کندھا دروازے کے شیشے سے ٹکرایا۔ شیشہ ٹوٹا اور اس کا کندھا خالی حصے میں دھنسنے لگا۔ اذیت کی ایک تند موج اٹھی۔ اس کے ہونٹوں سے چیخ نکلی اور وہ فرش پر گرتا چلا گیا۔

لاؤنج میں بابر نے بھی وہ آواز سنی لیکن اس نے اٹھنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کس عمل کا ردعمل ظاہر ہو رہا ہے وہ صوفے پر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے نظریں اٹھا کر شہلا کو دیکھا "اگر یہ ٹیچر راہداری میں قدم بھی رکھے تو اسے شوٹ کر دینا۔"

پھر وہ بڑے تحمل سے شہلا کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ اسے امید تھی کہ فائر کی آواز نہیں سنائی دے گی۔ یہ ٹیچر کمال رشید اس کے لئے ذاتی نوعیت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ ایسے کسی شخص کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، جو وسائل سے محروم ہونے کے باوجود حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرے۔ وہ اس شخص کو موت کے علاوہ ہر طرح کی اذیت دینا چاہتا تھا.......... کم از کم فی الوقت۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ کام کیسے کرے گا؟ کچھ بھی ہو، اسے اس ٹیچر کو اس کے آئیڈیلز کی دنیا سے کھینچ کر باہر لانا تھا۔ اس کے لئے حربوں کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا تھا کہ جا کر صوفیہ کو شوٹ کرے لیکن ایسا نہ کرنے کی معقول وجوہ موجود تھیں۔ بعد میں.......... بوقت ضرورت خوف و ہراس پھیلانے کے لئے اسے استعمال کیا جا سکتا تھا اور پھر یہ امکان بھی موجود تھا کہ ممکن ہے، کمال کے لئے وہ اتنی اہمیت ہی نہ رکھتی ہو۔ بابر.......... بلکہ اشوک یعنی بابر اس بات کا قائل تھا کہ کوئی عمل بے سود نہیں ہونا چاہئے۔ ہر عمل کے مطلوبہ نتائج حاصل ہونے چاہئیں۔ قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بشرطیکہ اس سے شدید خوف اور دہشت زدگی کا ردعمل حاصل کیا جائے۔

وہ ٹیچر کمال رشید کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ انٹلکچوئل آدمی تھا۔ قتل سے بس اس کی طبیعت بگڑ سکتی تھی لیکن کیا قتل کمال کے اس حفاظتی حصار کو توڑ سکتا تھا جو اس کے اور سنگین حقیقتوں کے درمیان حد فاصل کی حیثیت رکھتا تھا۔ نہیں.......... شاید نہیں۔ اس کی حقیقی دنیا عمل کی نہیں، لفظوں کی تھی جو کلاس روم کی اس محدود دنیا میں

اس کے ہونٹوں سے بہتے تھے۔ وہ اس کے سامعین تھے' جن سے وہ اپنے آئیڈیلز کے لئے تحفظ کشید کرتا تھا۔ وہ اسے کبھی چیلنج نہیں کرتے تھے اور چیلنج کا نہ ہونا ہی اس کی خود اعتمادی کا ضامن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سب ٹیچر ایسے ہی ہوتے ہیں اور ایسے کسی آدمی پر کیسے اٹیک کیا جاسکتا ہے؟ نہیں.......... اس کے لئے ان چہروں پر اٹیک کیا جاتا ہے' جو اسے خود اعتمادی فراہم کرتے ہیں۔

شہلا واپس آگئی تھی۔ اس نے کہا "وہ ٹیچر فرش پر گر پڑا تھا۔"

"گر پڑا تھا! مگر کیسے؟"

"میں ان سے زیادہ تفصیل نہیں اگلوا سکی۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ دروازے سے ٹکرا گیا تھا۔"

"وہ زخمی ہوا ہے؟"

"میرا خیال ہے' شیشے سے کٹ لگے ہیں لیکن زیادہ زخمی نہیں ہوا۔ وہ گولی کے زخم والے کندھے کے بل گرا تھا۔ بے ہوش ہوگیا ہے۔"

"اور وہ لڑکی کلاس روم میں موجود تھی؟"

"خوب صورت والی؟"

"تم جانتی ہو' میں کس لڑکی کو پوچھ رہا ہوں۔"

"وہ فرش پر بیٹھی ہے۔"

اشوک نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لئے منہ پھیر لیا۔ اسے اس لڑکی نازیہ کی آخری جھلک یاد تھی۔ وہ ریسٹ روم کے فرش پر پڑی رو رہی تھی۔ اگر اسے کمال کو سزا نہ دینا ہوتی تب بھی وہ اس لڑکی کو ہرگز نہ چھوڑتا۔ معصومیت ہر رنگ' ہر روپ میں اسے چیلنج محسوس ہوتی.......... پامال کرنے پر اکساتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو اس کے خوب صورت بالوں کو ایک ایک کرکے کھینچتا اور توڑ ڈالتا۔

وہ اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ جما کر اسے گھسیٹتا ہوا ریسٹ روم میں لے گیا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں رہی۔ اب وہ ایک بے وقعت اور قابل نفرت چیز تھی اس کے لئے۔ اس کا گڑگڑانا' اس کی وہ کھلی دہشت۔ اس کا رونا اور اس

کی سسکیاں.......... بس اس کے لئے یہی کچھ دل بستگی کا سامان تھا اور یہ خیال کہ اس نے صرف پندرہ منٹ میں اس کی معصوم روح پر ایک ایسا گھاؤ لگادیا تھا' جو زندگی بھر بھی مندمل نہیں ہوسکتا تھا' وہ مطمئن تھا۔

اس نے ببلا کو بیچ والے زینوں کی طرف بھیج دیا کہ وہ نذیر کو چھٹی دے دے پھر اس نے اپنے لئے پیالی میں کافی انڈیلی اور صوفے کی پشت گاہ سے ٹکتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کمال کو اور کس طرح سزا دی جاسکتی ہے۔ جسمانی طور پر تو وہ اسے توڑ چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ذہنی طور پر بھی کمال اب کسی قابل نہیں رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب وہ پوری طرح نمٹ چکے گا تو کمال کا کیا بچے گا؟ محض ڈھانچا! اسے یقین تھا کہ آخر میں کمال اندر سے خالی ہوگا.......... بالکل خالی.......... کھوکھلا! ایک انسان کو کچلنا کوئی مشکل کام تو نہیں۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو نذیر قریب ہی کھڑا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔ "کیا مسئلہ ہے نذیر!" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"چہرے سے تو کچھ اور لگ رہا ہے۔"

نذیر نظریں چرانے لگا "میں سوچ رہا تھا' جب تم اس طرح آنکھیں بند کرتے ہو تو کیا سوچ رہے ہوتے ہو۔"

"بہت خوش گوار ہوتی ہیں میری سوچیں۔ کیا چہرے پر ان کا عکس نظر نہیں آتا ہے؟"

"نہیں۔"

"تو کیا نظر آتا ہے؟"

"میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔"

"کیا تمہیں اس سے خوف آتا ہے؟"

"اگر میں تمہیں جانتا نہ ہوتا تو یقیناً خوف زدہ ہوجاتا۔"

"گڈ۔ اب میں ذرا کلاس روم میں جارہا ہوں۔ تم یہیں ٹھہروگے۔"

کلاس روم کی طرف بڑھتے ہوئے اشوک کو اپنے جسم میں سنسنی سی دوڑتی ہو(ئی) محسوس ہوئی۔ راہداری میں' دروازے کے سامنے اس کے جوتوں سے ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے ٹکرائے۔ اس نے دروازہ کھولا اور سوئچ دبا کر روشنی کر دی اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ طلباء کا جائزہ لیا۔ ان میں کچھ نیند بھری نظروں سے اسے تک رہے تھے۔ بالآخر اس کی نظریں کلاس روم کے سامنے والے حصے میں بیٹھی ہوئی صوفیہ پر پڑیں۔ اس نے نازیہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹا ہوا تھا۔

نازیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں دہشت جھلکنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے۔ اسے دیکھ اور پہچان کر اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

وہ مسکرایا "میں تو بس اپنے دوست کمال رشید کا حال دیکھنے آیا ہوں۔ سنا ہے یہ گر گیا تھا۔ ٹھیک تو ہے نا؟"

صوفیہ کے بے تاثر چہرے کی نقاب سے نفرت جھلکنے لگی "خدا کے لئے ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ جو کچھ تم اب تک کر چکے ہو' کیا وہ کافی نہیں ہے؟"

"یہ سوال تو میں اس بودے ٹیچر سے کرنے آیا تھا کہ مزاج کچھ ٹھکانے آئے یا نہیں" وہ کمال کی طرف بڑھا' جو فرش پر ساکت پڑا تھا۔ اس کا سر البتہ آہستہ آہستہ ادھر سے ادھر ہل رہا تھا شاید وہ ہوش میں آ رہا تھا۔

بابر نے گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے اس کے رخسار پر تھپڑ مارا۔ کمال کی آنکھیں کھل گئیں۔ چند لمحوں میں بابر کو یقین ہو گیا کہ وہ اسے پہچان چکا ہے "کہو مسٹر کمال' کچھ تسلی ہوئی یا نہیں؟" اس نے نہایت بے رحمی سے پوچھا "یہ صوفیہ تو کہتی ہے کہ بہت ہو گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں تمہارے لئے صرف اتنا کافی نہیں" وہ جھک کر کمال کی آنکھوں میں دیکھتا رہا جو پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔ کمال کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے لیکن چہرہ بے تاثر تھا۔ اس کی آنکھوں میں اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ "میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہاری اسٹوڈنٹ مجھے پسند آئی۔ لطف آ گیا" اس نے ایک اور وار کیا "تم خود بھی کبھی آزما دیکھو!" اسے توقع تھی کہ اب وہ پلکیں جھپکیں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کے اندر تند غصہ ابلنے لگا۔ وہ اس کی توہین تھی کہ اس کی بات کا کوئی اثر

ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر صوفیہ کی طرف بڑھا۔ اس نے اس کا بازو تھام لیا۔ صوفیہ نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔

"اپنے گندے ہاتھ ہٹاؤ۔" صوفیہ چلائی "مت چھوؤ مجھے۔"

بابر نے الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ رسید کیا۔ اس نے جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف کر کے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ اگلے ہی لمحے چرر چرر کی آواز کے ساتھ صوفیہ کی قمیض سامنے سے پھٹتی چلی گئی۔ بابر اب ہانپ رہا تھا "سوچتا ہوں' اگلی بار اسے اپنی قربت سے نوازوں" اس نے کمال سے کہا "ویسے اس میں رکھا کچھ بھی نہیں ہے لیکن تم مائنڈ تو نہیں کرو گے مسٹر کمال۔ نہیں کرو گے نا مائنڈ۔"

وہ بے تاثر نگاہیں اب بھی اسے گھور رہی تھیں۔ اب بھی کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔

بابر کا اب غصے سے برا حال تھا۔ صوفیہ اس کی ٹانگوں کو نوچ کھسوٹ رہی تھی۔ اس نے اس کے بال مٹھی میں پکڑ کر جھٹکا دیا۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ بے بسی سے گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ "اس کو میں بعد کے لئے بچا رکھوں تو بہتر ہے" اس نے کمال سے کہا "ایسی گئی گزری بھی نہیں ہے۔ تم نے کبھی اسے اس انداز میں دیکھا ہے؟" اس نے صوفیہ کے بال تھام کر پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ یوں اس کی برہنگی اور عیاں ہو گئی۔ بابر نے مکروہ قہقہہ لگایا اور صوفیہ کو پرے دھکیلتے ہوئے دوبارہ کمال کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنا گھٹنا کمال کے چہرے پر مارا۔ کمال کا چہرہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا اور اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ وہ دیوار کی طرف لڑھک گیا۔ بابر اب جیسے مطمئن تھا۔ وہ نیچے گری ہوئی صوفیہ کو پھلانگ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر جانے سے پہلے اس نے لائٹ آف کر دی اور پلٹ کر چلایا "شب بخیر۔ ہیو اے نائس نائٹ۔"

باہر ہال میں نذیر اس کا منتظر تھا۔ نذیر لاؤنج کی طرف جاتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا "میں نے تمہیں وہیں ٹھہرنے کو کہا تھا" بابر نے سخت لہجے میں کہا۔

"تم نے مجھے نروس کر دیا تھا۔"

"وہ کمرے میں داخل ہوئے اور صوفے پر بیٹھ گئے "نروس ہونے کی کوئی

ضرورت نہیں۔"

"تم بہت زیادہ دباؤ ڈال رہے ہو ان پر" نذیر نے کہا۔

"آغاز تم نے کیا تھا۔ انجام کی طرف میں لے جا رہا ہوں۔"

"اسے میں نہیں جھکا سکا۔ وہ بہت ضدی ہے۔ اور سنو.......... اب وہ بہت زیاد جھیل سکتا ہے اور وہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ ہمارے لئے خطرہ نہیں بن سکتا۔ اس سے پہلے ہی و مر چکا ہو گا۔"

"کاش ایسا ہی ہو۔"

بابر صوفے پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ اب گفتگو کی گنجائش نہیں۔ نذیر کرسی میں بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اسے اب یہ شخص برا لگنے لگا تھا۔ و سرد مزاج پروفیشنل ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا۔ وہ صرف آپریشن کی کامیاب تکمیل کے لئے نہیں تھا۔ اس کے لئے اپنی انا بہت اہم تھی۔ لگتا تھا' اس کے اندر غلاظت اور بے پناہ نفرت بھری ہوئی ہے اور اس غلاظت اور نفرت سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ ورنہ ان یرغمالیوں سے اس کا کوئی ذاتی تعلق تو نہیں تھا لیکن وہ انہیں جان بوجھ کر اذیت پہنچا رہا تھا۔ یہ پروفیشنل ازم نہیں ہے۔ اس نے تلخی سے سوچا۔

نذیر کو یقین تھا کہ اس کا خیال درست ہے۔ کسی بھی شخص کو ایک حد تک ہی دھکیلا جا سکتا ہے۔ پاؤں کے نیچے دب کر تو چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔ کمال تو ایک مضبوط اور جری انسان ثابت ہوا تھا۔ خود اس کی برداشت کی بھی کوئی حد تو تھی۔ وہ بے رحمی کے مظاہرے ایک حد تک ہی دیکھ سکتا تھا۔ ماسٹر کمال انسان تھا' کوئی چوہا نہیں تھا۔ بابر اس کے ساتھ بلی چوہے کا کھیل کھیل رہا تھا اور نذیر چوہے کے کھائے جانے کا منظر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کو ایک اور خیال آیا۔ بابر کے بلی ہونے میں تو کوئی شک نہیں تھا لیکن کیا ماسٹر کمال واقعی چوہا تھا؟ اس کے گولی لگی تھی۔ اسے مارا بھی بہت گیا تھا لیکن وہ اپنی جگہ ڈٹا رہا تھا۔ وہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ ممکن ہے' وہ کوئی وقتی ردعمل رہا ہو۔ کچھ بھی ہو' نذیر کے لئے وہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کبھی

بابر اور کمال میں تصادم ہو تو وہ اس میں ملوث ہو۔

نذیر نے پاؤں پھیلا لئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے پاس سونے کے لئے چار گھنٹے کی مہلت تھی۔ اس نے سوچا سب کچھ سوچنے میں کیوں ضائع کیا جائے۔

☆============☆============☆

کمال نے اپنی نظریں دیوار پر جمائیں اور پلکیں جھپکائیں۔ ناک سے جاری ہونے والا خون رک چکا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگا لیٹا تھا۔ سانس وہ منہ سے لے رہا تھا۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے مزید کتنا نقصان پہنچا تھا۔ یہ طے تھا کہ اس کی ناک ٹوٹ گئی ہے۔ البتہ منہ اور دانت سلامت تھے۔ لاتیں اس نے زیادہ تر اپنے سینے پر کھائی تھیں۔ وہ اسی وقت بابر کے پیچھے جاتا لیکن نکسیر پھوٹنے کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ وہ کچھ دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ تکلیف نے اسے مہلت ہی نہیں دی تھی اور جب مہلت دی تو اسے معلوم تھا کہ بابر دور جا چکا ہے۔

وہ گھسٹتا ہوا صوفیہ کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ اس کا جسم سسکیوں سے لرز رہا تھا۔ اس نے چادر میں پھٹی ہوئی قمیض کو چھپا لیا تھا۔ اس نے نرمی سے اس کے سر کو سہلایا۔ اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی بائیں آنکھ سوج گئی تھی اور ہونٹوں کے بائیں گوشے پر خون کی پتلی سی لکیر نظر آ رہی تھی۔

"میری ناک اور تمہاری آنکھ۔ کیا خوبصورت جوڑی ہے۔" کمال نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔

"شکریہ۔"

"کیوں نہ ہم دونوں کھڑے ہونے کا تجربہ کریں۔ دیکھیں تو.......... کیا ہوتا ہے؟"

صوفیہ ہی پہلے اٹھی پھر اس نے اسے سہارا دے کر کھڑے ہونے میں مدد دی۔

کمال کو اپنی متلی کا احساس نہیں ہو رہا تھا لیکن وہ بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا وہ بمشکل ایک منٹ کھڑا رہا پھر بیٹھنے پر مجبور ہو گیا "ایک وقت تھا کہ مجھ پر بڑی سے بڑی تکلیف کا اثر نہیں ہوتا تھا" اس نے کمزور آواز میں کہا "لگتا ہے' بوڑھا ہو رہا ہوں میں۔"

صوفیہ نے گیلے کپڑے سے اس کا چہرہ صاف کیا پھر کمال نے اسی طرح صوفیہ کا چہرہ صاف کیا۔ اب اس کے بازو کی پٹی بھی بدلی جانی تھی۔ زخم کی صفائی بہت تکلیف دہ مرحلہ تھی۔ وہ دانتوں سے ہونٹ کاٹتا رہا لیکن پھر وہ پُرسکون ہوگیا۔ درد اب پہلے جیسا نہیں تھا یا پھر وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے بائیں بازو پر نظر ڈالی تو اسے احساس ہوا کہ یہ ہاتھ بیکار ہو چکا ہے۔ پہلے تو وہ اسے ہلا سکتا تھا لیکن اب وہ بے جان انداز میں لٹک رہا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود اسے نہ ہلا سکا۔ صوفیہ دوسری پٹی کرنے میں مصروف تھی۔

کمال نے نیم تاریک کمرے کی طرف رخ کرکے پکارا "رئیس!"

اگلے ہی لمحے ایک سایہ اس کی طرف چلا آیا "جی سر۔ آپ ٹھیک تو ہیں سر!" رئیس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"وقت کے ساتھ بہتر ہوتا جاؤں گا انشاء اللہ" کمال نے کہا "مجھے افسوس ہے۔"

"نہیں سر۔ افسوس تو مجھے ہے۔ اپنی ہر بات پر......... ہر کوتاہی پر میں شرمندہ ہوں۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بات یہاں تک پہنچے گی۔"

کمال اسے منفی سوچ اور دہشت گردی کے متعلق اچھی طرح سمجھانا چاہتا تھا۔ وہ اچھا موقع تھا۔ رئیس پہلی بار بات سننے کے موڈ میں تھا لیکن کمال نے اس لمحے کو گزر جانے دیا۔ اتنا بڑا عملی تجربہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لڑکا اب خود بھی بہت کچھ سمجھ سکتا تھا۔ اسے بہت مہنگا سبق ملا تھا۔ "مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے" اس نے کہا "تمہارے ساتھیوں کا کیا حال ہے؟"

"وہ بہت ڈرے ہوئے ہیں سر۔ جب سے وہ شخص بابر یہاں سے گیا ہے' کسی کے منہ سے آواز بھی نہیں نکلی ہے۔ اس وقت سے کوئی سویا بھی نہیں ہے۔ سب بیٹھے ہوئے فرش کو گھور رہے ہیں۔ سر......... وہ تو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے بھی ڈر رہے ہیں۔"

کمال نے سوچا' انسان کی درندگی کا مظاہرہ ایسا ہی خوف ناک ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ان لوگوں کا حوصلہ قابل ستائش تھا۔ "تم شاک سمجھتے ہو رئیس؟" اس نے پوچھا۔ رئیس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تمہارے خیال میں ان میں سے کچھ شاک کی حالت میں

ہیں؟"

"میرے خیال میں کسی کا بھی ایسا حال نہیں ہے سر۔"

"ایسا کرو! تم جا کر دوبارہ جائزہ لو۔ ہر ایک کو اچھی طرح دیکھنا۔ بات کرکے بھی چیک کرنا۔ یہ کام بڑی خاموشی سے کرنا ہے۔ چیک کرکے میرے پاس واپس آنا۔"

رئیس نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور طلباء کی طرف چلا گیا۔

صوفیہ یہ گفتگو خاموشی سے سنتی رہی تھی۔ وہ بدستور پٹی کرنے میں مصروف تھی۔ رئیس کے جانے کے بعد اس نے پوچھا "ہمیں اور انتظار نہیں کرنا چاہئے۔"

"میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ بابر کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ وہ مجھے توڑنے کی کوشش میں ہے" کمال نے کہا "وہ یہاں آتا رہے گا......... بار بار آئے گا۔ وہ ہر وہ حرکت کرے گا' جس سے اس کے خیال میں مجھے تکلیف پہنچ سکے۔ صرف میری بات ہوتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں اسے ہینڈل کرسکتا تھا لیکن وہ میری کمزوری سے واقف ہے۔ تم......... در میرے یہ طلباء میری کمزوری ہیں۔ تم لوگوں کے ذریعے وہ مسلسل مجھ پر کاری وار کر سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ جلد از جلد نکل جاؤ۔ اس سے پہلے کہ میری مدافعت تم ہو' تم لوگوں کو یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

"اور وہ واپس آیا اور میدان صاف ہوا تو تمہیں ختم کردے گا۔"

"مجھے یقین ہے کہ آخر میں وہ کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ پیدائشی اذیت پسند اور دہشت گرد معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے فوری طور پر کچھ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔"

"تم نے رئیس کو کیوں منتخب کیا؟"

"اس لئے کہ میں جانتا ہوں' وہ سب سے زیادہ حوصلے والا ہے۔ بدتمیز بچوں میں بہت سی خوبیاں چھپی ہوتی ہیں۔"

اسی وقت اندھیرے میں سے رئیس نمودار ہوگیا "سر......... وہ سب بری طرح ہلے ہوئے ہیں لیکن شاک کی حالت میں نانویہ کے سوا کوئی نہیں ہے" اس نے بتایا۔

"گڈ۔ اب غور سے سنو۔ ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی ہے" کمال نے کہا

"میں چاہتا ہوں کہ یہ کام سادگی سے کیا جائے۔ پچھلی کھڑکی سے آگ سے بچاؤ وا
زینے پر کودا جاسکتا ہے۔ یہاں سے نیچے پارکنگ میں اترا جاسکتا ہے۔ وہاں خود کو سا
میں چھپائے رکھیں اور پھر طوفانی رفتار سے اسٹیڈیم کی طرف بھاگیں۔ دو تین لڑکے ز
پر پہنچ جائیں تو وہ دوسروں کی مدد کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ کام ہر ایک کے بس
نہیں.........."

رئیس نے اس کی بات کاٹ دی "سر پردوں کو پھاڑ کر رسی کی طرح استعمال
جاسکتا ہے اور اسی رسی کو کھڑکی سے باندھا جاسکتا ہے۔ اکبر کے پاس چاقو موجود ہے۔"

"بہت اچھا آئیڈیا ہے۔" کمال نے ستائشی لہجے میں کہا "مگر پہلا کام سب کو سم
ہے کہ ہم کیا کرنے والے ہیں.......... اچھا' کچھ پوچھنا ہے تمہیں؟"

"نہیں سر۔"

"تو ٹھیک ہے' جاکر سب کو سمجھا دو۔"

چند لمحے بعد کمرا سرگوشیوں اور پہلو بدلنے کی آوازوں سے بھر گیا۔ اندھیرے
متحرک ہیولے دکھائی دینے لگے پھر پردوں کو کاٹ کر ڈوریاں بنائی جانے لگیں۔ ا
خاصی آوازیں ہونے لگیں حالانکہ صرف رئیس بول رہا تھا۔ وہ ہر بار ایک ہی بات دہ
تھا لیکن لفظ سنائی نہیں دے رہے تھے۔ کمال کو کمرے کے ماحول میں کشیدگی
محسوس ہو رہی تھی۔ صورت حال کے متعلق سن کر طلباء کے جسم کمانوں کی طرح کھنچ
تھے۔ پہلی بار ان کے لئے امید کی کوئی کرن پھوٹی تھی۔ خود کمال کو اپنے جسم میں
سی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے اس کے جسم میں توانائی کا کوئی پوشیدہ
پھوٹ نکلا ہو۔

پھر ایک کھڑکی بڑے پرشور انداز میں کھلی۔ کمال نے بڑی مشکل سے خود کو
سے روکا۔ وہ خوف زدہ ہوگیا۔ اتنی بلند اور واضح آواز! ساتھ ہی کاریڈور میں قریب
قدموں کی آواز ابھری۔ "ہش.......... آواز نہیں" اس نے سرگوشی میں تنبیہہ کی۔

نذیر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سوئچ دبا کر روشنی کر دی۔ اس کے چہ
پریشانی کا تاثر تھا۔ جیسے وہ کمرے میں کسی غیر معمولی تبدیلی کی توقع کر رہا ہو۔ اا

اسٹوڈنٹس کو غور سے دیکھا۔ ان میں سے بیشتر سو رہے تھے۔ کچھ نے روشنی سے بچنے کے لئے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے تھے۔ دو لڑکے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے چندھیائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں کوئی گڑبڑ تھی ضرور لیکن وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے گنتی کی لیکن طلباء پورے تھے۔ کمال رشید فرش پر لیٹا سو رہا تھا۔ خوب صورت لڑکی.......... نازیہ کو ٹیچر صوفیہ اپنی بانہوں میں لئے بیٹھی تھی۔ نذیر کمرے میں ادھر ادھر دیکھتا رہا کہ شاید پتا چل جائے کہ اسے سنائی دینے والی آواز کیسی تھی.......... کس چیز کی تھی لیکن وہ معما حل نہیں ہوا۔

کمال سانس روکے فرش پر لیٹا رہا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کمرے میں آئی تھی۔ ماحول تیزی سے سرد ہو رہا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کسی بھی لمحے نذیر کو یہ تبدیلی محسوس ہوجائے گی اور پھر سب کچھ ختم ہوجائے گا۔ نجات کی کوشش آغاز سے پہلے ہی ختم..........

وہ انتظار کرتا رہا پھر کلک کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے ردعمل پر قابو پایا پھر اسے احساس ہوا کہ وہ سوئچ آف کئے جانے کی آواز تھی۔ کمرے میں اندھیرا ہوگیا تھا اور نذیر باہر جا رہا تھا۔

وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھا۔ تیز دھڑکنوں کو معمول پر آنے میں کچھ دیر لگی پھر اسے آہٹ سنائی دی اس نے سر گھما کر دیکھا رئیس اس کے پاس کھڑا تھا۔

"اب ہم جائیں سر؟" رئیس نے پوچھا۔

کمال چند لمحے سماعت پر زور دیتا رہا لیکن کمرے کے باہر کوئی آہٹ نہیں تھی مگر ذرا ہی اسے ایک نامانوس سی آواز سنائی دی' جو اس نے پہلے نہیں سنی تھی۔ وہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا' بالآخر اس نے کہا "رئیس.......... ذرا ٹھہرو۔ چھت پر کوئی موجود ہے۔"

☆==========☆==========☆

ایس پی جلیس اسکور بورڈ والے کیبن میں بیٹھا اسکول کی عمارت کی طرف دیکھ رہا تھا' جو اندھیرے میں ایک بہت بڑے ہیولے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ کاش وہ کسی

طرح ان کھڑکیوں کے پیچھے جھانک سکتا۔ اسے اپنے باہر کے چالیس آدمیوں کی نقل و حرکت کا پوری طرح علم تھا لیکن اس کے جو مٹھی بھر جوان اسکول کی عمارت کی چھت پر تھے' ان سے وہ بے خبر تھا۔

شاید اس حقیقت نے کہ اس کا بیٹا بھی یرغمالیوں میں شامل ہے' اسے ایک ایسا ایکشن لینے پر مجبور کر دیا تھا' جس کے ماحصل سے وہ مطمئن نہیں تھا یا شاید اس کے پیچھے اس کی انصاف پسندی کار فرما تھی۔ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا اس کا فرض تھا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی رہی ہو' وہ ایسے احکامات دے چکا تھا' جن کے نتیجے میں اب کچھ نہ کچھ ہونا تھا۔ ہاں.......... اس کے آدمی تربیت یافتہ اور ڈسپلن کے تحت کام کرنے والے تھے۔ ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اور وہ نشانے کے بھی سچے تھے۔ اس کے باوجود کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ مجرموں کے ردعمل کے بارے میں درست اندازہ کبھی نہیں لگایا جاسکتا۔ وہ اس توقع پر یہ ایکشن لے رہا تھا کہ موت کو سامنے دیکھ کر مجرموں کے اعصاب جواب دے جائیں گے اور وہ ہتھیار ڈال دیں گے۔

اس نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر عمارت کے عقبی حصے پر نظر ڈالی۔ اب سے چند منٹ بعد اس کے جوان پوزیشن سنبھال لیں گے اور پھر اس کا کیریئر داؤ پر لگ جائے گا۔ کامیابی اسے شہرت اور ترقی دلواتی اور ناکامی.......... اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس صورت میں اس کا سب کچھ چھن سکتا تھا۔

اس نے سگریٹ سلگائی اور پھر عمارت کی طرف متوجہ ہو گیا وہ اس کال کا منتظر تھا جو اسے بتاتی کہ اس کے جوان ایکشن کے لئے تیار ہیں۔ منصوبہ سیدھا سادہ تھا۔ جمنازیم کے عقب سے بارہ افراد کو عمارت کی چھت پر پہنچنا تھا۔ جمنازیم کی چھت سے اسکول پر پہنچنے کا ذریعہ رسی تھی۔ اسکول کی چھت پر پہنچنے کے بعد خطرے کی حدود شروع ہوتی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر منصوبے کو ذہن میں دہرایا۔ کہیں بہت زیادہ خطرہ مول نہیں لیا جارہا ہے۔ رسی کی مدد سے ان لوگوں کو تیسری منزل کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ کر اندر داخل ہونا تھا اور اس وقت عمارت کے گرد گھیرا ڈالنے والے جوانوں کو اندرونی زینوں اور آگ سے بچاؤ والے زینے پر جھپٹنا تھا۔ اس منصوبے میں دو مثبت عناصر تھے۔

حیرت اور عددی برتری۔ اس کے جوانوں کو بلٹ پروف جیکٹس اور گیس ماسک میسر تھے۔ ٹائمنگ درست رہی تو اس کے چالیس جوان تیسری منزل پر مجرموں سے ٹکرائیں گے۔ سب کچھ منصوبے کے مطابق ہوا تو مجرموں کو مزاحمت کا موقع نہیں ملے گا اور اگر انہوں نے مزاحمت کی تو وہ مارے جائیں گے۔ اس نے اپنے جوانوں کو ضرورت کے تحت فائر کرنے کی کھلی آزادی دی تھی۔

اس نے وزارت داخلہ سے اور اپنے آئی جی سے رابطہ کیا تھا۔ آئی جی نے اس پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ جبکہ وزارت داخلہ نے بتایا تھا کہ فوری طور پر وزیر داخلہ سے رابطہ کیا جائے گا اور وزیراعظم کو بھی مطلع کر دیا جائے گا انہوں نے یقین دلایا تھا کہ زر تاوان کا بندوبست کر دیا جائے گا لیکن بہتر یہی ہے کہ دہشت گردی کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے جائیں۔ انہوں نے اس سے پوچھا تھا کہ اسے کسی وفاقی ایجنسی کی مدد کی ضرورت ہو تو بتائے؟

"جناب! یہ مسئلہ صرف عددی برتری سے حل ہونے والا نہیں۔ مختلف ایجنسیوں کے ہجوم میں کام بگڑ بھی سکتا ہے" اس نے جواب دیا تھا۔

اسی وقت اسکول کا پرنسپل جمیل الرحمٰن بوتھ میں چلا آیا "اور کتنی دیر ہے؟" اس نے پوچھا۔

جلیس نے گھڑی پر نظر ڈالی "ابھی دس منٹ باقی ہیں۔"

"میری دعا ہے کہ تمہارا منصوبہ کامیاب رہے۔"

"ناکامی کی صورت میں میری تباہی یقینی ہے۔"

"تمہارا اس میں کیا قصور ہو گا؟"

"بڑا عہدہ بڑی ذمے داری بھی لاتا ہے اور یہ تو غیر معمولی صورت حال ہے" جلیس نے آہ بھر کے کہا "اور منصوبے میں گڑبڑ خارج از امکان نہیں۔ ٹائمنگ میں معمولی سا فرق بھی پڑا تو تیس سیکنڈ میں بھی وہ لوگ خاصی تعداد میں بچوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس کے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی "اور وہ زینوں کو بھی اڑا سکتے ہیں" سب سے زیادہ فکر درحقیقت اسے اس بات کی تھی۔ اگر اس کے نیچے والے جوان اوپر نہیں پہنچ پائے تو مجرموں کے لئے اوپر والوں سے نمٹنا بہت آسان ہو گا' یہ کوئی آسان

فیصلہ نہیں تھا لیکن وہ اور کرتا بھی کیا۔ وہ ابھی ایکشن نہ لیتا تو کیس کسی اور ایجنسی کے ہاتھوں میں چلا جاتا۔ امکان یہی تھا کہ فوج کا ایس ایس گروپ کسی بھی وقت اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے اور یہ صوبائی حکومت کی.......... اور محکمہ پولیس کی بھی توہین ہوتی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ پولیس سے بہتر انداز میں اس معاملے کو نمٹا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود پیشہ ورانہ رقابت اپنی جگہ تھی۔ کام تو وہ بہرحال اس کا ہی تھا۔ کوئی اور انجام دیتا تو اس کے محکمے کی نااہلی سامنے آتی۔ ویسے بھی جرم اس کے علاقے میں ہوا تھا۔ مجرم اس کا شکار تھے۔

جمیل الرحمٰن نے سگریٹ کا کش لیا۔ اندھیرے میں سگریٹ کا سرا بہت روشن نظر آرہا تھا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں پہلے نہیں سمجھ سکا" اس نے کہا "میں نے سوچا بھی نہیں کہ نعمان جلیس تمہارا بیٹا ہے۔ کیسا اتفاق ہے کہ وہ بھی یرغمالیوں میں شامل ہے۔"

جلیس نے سگریٹ سے سگریٹ جلائی "ایک زمانے میں' میں نے سگریٹ نوشی ترک کردی تھی" اس نے سگریٹ کے ٹوٹے کو فرش پر پھینک کر جوتے سے مسلا پھر بولا "مجھے امید نہیں تھی کہ آپ اس پریشانی میں یہ تعلق سمجھ سکیں گے لیکن میرے اکلوتے بیٹے کا اس اسکول میں پڑھنا کوئی غیر معمولی بات نہیں اور اتفاق سے وہ آج انگلش کی کلاس میں تھا۔"

"کاش.......... اس نے تمہارے متعلق ڈینگیں مارنے کی حماقت نہ کی ہو" جمیل الرحمٰن نے کہا "اس سے مجرموں کو اپنی قوت بڑھنے کا احساس ہوگا۔"

اندھیرے میں جمیل الرحمٰن کو اندازہ نہیں ہوسکا کہ اس بات نے ایس پی جلیس کو ہلا ڈالا ہے "مجھے سچ بتائیے گا۔ میرا بیٹا کیسا لڑکا ہے؟" جلیس نے پوچھا۔

جمیل الرحمٰن کے لئے یہ استفسار حیران کن تھا۔ "دیکھو.......... میں تمام طلباء کو نہیں جانتا لیکن تمہارے بیٹے کو تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ وہ اچھا طالب علم ہے۔ اسپورٹس اور دیگر سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتا ہے' اسکول کی سیاست میں بھی اس کا دخل ہے۔ نہ تو وہ ہمارا بہترین اسٹوڈنٹ ہے' نہ بہترین کھلاڑی لیکن مجموعی طور پر وہ اپنی کلاس کے ٹاپ اسٹوڈنٹس میں شمار ہوتا ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر جلیس نے کہا "میں ایسا نہیں سمجھتا تھا.........."

"میں تمہیں ایک ہی اہم بات بتا سکتا ہوں۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ اسکول میں کیسا ہے۔ گھر میں لڑکوں کا رویہ عام طور پر باغیانہ ہی ہوتا ہے۔ مستقبل اچھے طالب علم کا ہی ہوتا ہے۔"

جلیس اب خاموش ہو کر وہ بات سوچ رہا تھا' جو ابتدا ہی سے اسے رہ رہ کر چبھ رہی تھی۔ کیا وہ اپنے بیٹے کو بحفاظت نکال کر لانے کے لئے اتنی انسانی جانوں کو داؤ پر لگا رہا ہے؟ ہر بار وہ اس سوچ کے بعد یہی دعا کرتا تھا کہ کاش ایسا نہ ہو۔ یہ تو ضمیر کے لئے مستقل خلش بنتی جارہی تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے تھے" جمیل الرحمٰن نے اسے چونکا دیا "اس صورت حال میں دماغ ٹھیک طرح سے کام ہی نہیں کرتا۔"

"کیا مطلب؟"

"اس یرغمالی کلاس میں ایک بہت اہم لڑکا موجود ہے۔ جانتے ہو' وہ وفاقی وزیر داخلہ کا بیٹا ہے.......... رئیس نام ہے اس کا۔"

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی جلیس اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا "یہ آپ مجھے اب بتا رہے.........." وہ جملہ پورا نہ کرسکا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "ہیلو.......... ایس پی جلیس اسپیکنگ" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"میں ہوم سیکریٹری بول رہا ہوں" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میری منسٹر صاحب سے بات ہوئی ہے۔ وہ دورہ مختصر کرکے فوراً واپس آرہے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کا بیٹا رئیس ظفر بھی اسی اسکول میں پڑھتا ہے۔ تم فوری طور پر مجھے کنفرم کرکے بتاؤ کہ.........."

"سر.......... ابھی چند سیکنڈ پہلے مجھے معلوم ہوا کہ منسٹر صاحب کا بیٹا بھی یرغمالی کلاس میں موجود ہے" جلیس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"تو پھر غور سے سنو۔ تمہیں کوئی ایکشن نہیں لینا ہے۔"

"لیکن سر! میں آرڈر دے چکا ہوں۔ اب کسی بھی لمحے آپریشن شروع ہوسکتا

ہے" جلیس کی پیشانی پسینے میں تر ہو گئی تھی۔

"فوراً روک دو ایکشن۔ تم سمجھ نہیں رہے ہو۔"

"لیکن جناب! وزیراعظم نے.........."

"ہاں۔ وزیراعظم نے کہا تھا کہ دہشت گردی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہئے لیکن وہ پرانی بات ہے۔ اب صورت حال بدل چکی ہے وزیراعظم کا کہنا ہے کہ انسانی جانوں کو خطرے میں نہیں ڈالا جائے۔ میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ کوئی کارروائی نہیں ہونی چاہئے۔ ورنہ نتائج کے ذمے دار تم ہو گے۔"

"سر.......... میں اب کچھ نہیں کر سکتا۔ ذرا ہولڈ کریں میں کوشش کرتا ہوں لیکن مشکل ہے سر.......... بہرحال.........."

"میں لائن ہولڈ کر رہا ہوں۔ تم معلوم کرو.........."

اسی وقت جمیل الرحمٰن نے کہا "ارے.......... انہوں نے اسکول کی لائٹس آف کر دی ہیں۔"

جلیس نے سر گھما کے دیکھا۔ تیسری منزل اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔ وہ میز کی طرف بڑھا' جہاں واکی ٹاکی رکھا تھا "جلیس اسپیکنگ۔ رپورٹ دو۔ کیا صورت حال ہے؟"

کیبن الیکٹرونیکل ٹرٹراہٹ سے بھر گیا پھر واکی ٹاکی پر ایک سرگوشی ابھری "جمشید بول رہا ہوں سر۔ میرے آدمی ابھی گھاس میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہمیں حرکت میں آنے میں پانچ منٹ لگیں گے۔ جمنازیم کی چھت سے اسکول کی چھت تک رسی تان دی گئی ہے۔ اس وقت ہمارا پانچواں آدمی اسکول کی چھت پر پہنچنے والا ہے۔ چار پہنچ چکے ہیں۔ پانچ منٹ لگیں گے سر۔"

"کیا تم لوگوں کو دیکھ لیا گیا ہے؟"

"میرا خیال ہے' نہیں۔"

"تو پھر لائٹ کیوں آف ہو گئی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم سر۔ کوئی نظر تو نہیں آرہا.........."

"اپنے آدمیوں کو واپس بلالو۔ آپریشن ملتوی سمجھو۔" جلیس نے کہا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر دوسری طرف سے کہا گیا "اب یہ ممکن نہیں ہے جناب۔"

"کیوں.......... کیا مسئلہ ہے؟"

"واکی ٹاکی جمنازیم کی چھت پر ہے۔ دوسری طرف سے ہمارا رابطہ منقطع ہو چکا ہے۔"

"تم انہیں سگنل نہیں دے سکتے؟"

"وہ پہلے ہی اسکول کی طرف پوزیشن لے چکے ہیں۔ میں نے انہیں ٹھیک دو بج کر دس منٹ پر آپریشن شروع کرنے کو کہا تھا۔ اب میں انہیں کسی طرح نہیں روک سکتا۔"

اسی وقت میدان کے اس طرف سے روشنی کے گولے اچھلنے لگے۔ ان کی آواز کسی بلند آہنگ سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

جلیس تیزی سے فون کی طرف جھپٹا "سوری سر۔ کارروائی شروع ہو چکی ہے۔"

"اب میں نہیں کہہ سکتا کہ تمہارا انجام کیا ہو گا؟" دوسری طرف سے ہوم سیکریٹری نے خشک لہجے میں کہا "دعا کرو کہ تمہاری کارروائی کامیاب نہ ہو' تب بھی طلباء کے لئے مہلک ثابت نہ ہو.........."

جلیس کو خوب اندازہ تھا کہ یہاں طلباء کا مطلب وزیرداخلہ کا بیٹا رئیس ظفر ہے۔ اس کا محفوظ رہنا ضروری تھا اور اس کے لئے اب وہ صرف دعا ہی کر سکتا تھا.......... اپنے بیٹے کی فکر بھول کر۔

"میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔" ہوم سیکریٹری نے کہا اور اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

جلیس ریسیور رکھ کر اسکول کی طرف دیکھنے لگا' جو روشنی کے شیلوں میں دھوپ میں نہایا ہوا لگ رہا تھا۔

☆==========☆==========☆

شہناز ایک جھٹکے سے بیدار ہوئی۔ اس نے اندھیرے میں کلاک کی چمک دار

سوئیوں کی طرف دیکھا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ تقریباً ایک گھنٹا سوتی رہی ہے۔ اپارٹمنٹ میں اندھیرا تھا۔ روشنی کی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے ادھر ادھر ٹٹولا۔ بالآخر اسے ریڈیو مل گیا۔ وہ بٹن دبانے ہی والی تھی کہ رک گئی۔ اب بابر کو کال کرتی تو اسے یہ اعتراف بھی کرنا پڑتا کہ اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور بابر اس کوتاہی پر یقیناً ناراض ہوتا۔ کیوں خواہ مخواہ مصیبت مول لی جائے۔ بہتر یہ ہے کہ بابر کی کال کا انتظار کیا جائے اور اگر بابر نے کہا کہ اس نے پہلے بھی کال کیا تھا تو وہ کہہ دے گی کہ ٹرانسمیشن اس تک نہیں پہنچ تھا۔ ممکن ہے' بابر شک کرے کہ وہ سوگئی تھی لیکن وہ یہ ثابت تو نہیں کرسکتا۔

وہ کھڑکی کی طرف گئی اور تاریکی میں کرسی پر جابیٹھی۔ بابر نے ٹھیک کہا تھا۔ پولیس بلڈنگ میں آئی تھی اور پوری عمارت خالی کرالی گئی تھی۔ انہوں نے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی تھی لیکن شہناز سانس روکے بیٹھی رہی تھی۔ کسی نے لٹو گھما کر دروازہ کھولنے کی بھی کوشش کی تھی اور شہناز کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ اس نے دروازہ تو لاک کردیا تھا مگر اسے ڈر تھا کہ ممکن ہے' انہوں نے بلڈنگ کے منیجر سے ڈپلی کیٹ چابی لے لی ہو۔ بالآخر اسے جاتے ہوئے قدموں کی دُور ہوتی ہوئی آہٹ سنائی دی اور اس نے سکون کی سانس لی تھی مگر وہ پوری طرح پُرسکون ایک گھنٹے بعد ہوسکی تھی۔

پھر اسکول کی عمارت اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ کھڑکی سے دور ہی رہی تھی۔ اس کے بعد وہ کھڑکی کے پاس گئی تو تھی لیکن اسے لگتا تھا کہ نامعلوم نگاہیں اب بھی اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کا جائزہ لے رہی ہیں۔ جیسے پولیس نے اسے کھڑکی میں دیکھ لیا ہے اور اب اسے چیک کرنے کے لئے آرہے ہیں کہ وہ بلڈنگ خالی کرائے جانے کے باوجود اس اپارٹمنٹ میں کیوں موجود ہے۔ چنانچہ اس کے کان آہٹوں کے خوف سے دروازے پر لگے رہے لیکن ہوا کچھ بھی نہیں۔

اس نے کرسی پر بیٹھ کر سامنے دیکھا۔ نائٹ اسکوپ اس کی گود میں رکھا تھا۔ چند گھنٹے بعد سورج طلوع ہونا تھا۔ شام کو پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ غروب آفتاب کا منظر کس قدر خوب صورت ہوتا ہے لیکن وہ منظر دیکھنے کے لئے کھڑکی کے قریب جانے کی

اسے ہمت نہیں ہوئی تھی اور پھر سورج غروب ہوگیا تھا۔ تنہائی میں وہ سناٹا بہت خوفناک اور اعصاب شکن محسوس ہورہا تھا۔

اب اس وقت وہ سناٹا اور مہیب ہوگیا تھا۔ وہ بابر کو کال کرنا چاہتی تھی۔ تنہائی کے احساس کو دور کرنے کی یہی ایک صورت تھی۔ کیونکہ یہاں تو تنہائی کے ڈراؤنے احساس سے نکالنے کے لئے کوئی آواز بھی نہیں تھی۔ دوسری طرف اسکول میں بھی سناٹا تھا۔ حد یہ کہ اسکول کے اسٹیڈیم میں بھی اندھیرا اور سناٹا تھا۔ بس اسکور بورڈ والے کیبن میں مدہم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

اچانک اسے ایک شک نے گھیرلیا۔ اسے احساس ہورہا تھا کہ اس کے سونے کے دوران کچھ ہوا ہے۔ کوئی بات ہوئی ہے لیکن وہ اسے سمجھ نہیں پارہی تھی۔ ہاں.......... کلاس روم میں اس وقت روشنی ہورہی تھی مگر اب وہاں اندھیرا تھا۔ اسٹیڈیم میں بھی ایک گھنٹا پہلے روشنی تھی مگر اب وہ بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ بے چین ہوگئی۔ اس کی انگلیوں نے گود میں رکھے نائٹ اسکوپ کو سہلا لیا۔ وہ اسے استعمال کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اگرچہ نیچے کے گھپ اندھیرے میں اس کے لئے تسلی اور سکون کا کوئی سامان نہیں تھا لیکن وہ نائٹ اسکوپ میں نظر آنے والے سرخ وسیاہ لرزیدہ عکس کے مقابلے میں پھر بھی لائق ترجیح تھا۔ نائٹ اسکوپ میں دیکھنا تو اسے ڈراؤنا خواب سا لگتا تھا۔ جیسے وہ کسی اجنبی سیارے میں جھانک رہی ہو۔ وہ خوف زدہ ہوجاتی تھی اس لئے بھی کہ وہ تنہا تھی لیکن شاید اس وقت اس کے ذہن میں یہ امید تھی کہ وہ کوئی ایسی بات دیکھے گی' جو بابر کو کال کرنے کا جواز بن جائے گی۔ کوئی بہانہ.......... کوئی جواز!

پہلے اس نے نائٹ اسکوپ کی مدد سے اسٹیڈیم کا جائزہ لیا۔ پارکنگ لاٹ میں اسے ایک کار کے بونٹ سے حدت کی سرخ لہریں اٹھتی دکھائی دیں۔ کاریں تو وہاں تھیں لیکن کوئی آدمی اسے نظر نہیں آیا۔ نائٹ اسکوپ نے اسٹیڈیم سے اسکول کی عمارت کے علاقے کو ٹٹولا۔ اسے گھاس پر کم از کم ایک درجن سرخ شعلے لرزتے دکھائی دیے مگر وہ ان کے متعلق اندازہ نہ لگا سکی۔ بابر نے کہا تھا کہ اسکوپ کسی بھی جسم یا کسی بھی شے سے اٹھنے والی حدت کی لہروں اور معمولی سی روشنی کو بھی پک کرلے گی۔ یہ درست تھا لیکن

شہناز کے لئے کسی جسم یا کسی شے میں فرق کرنا مشکل تھا۔

اس نے اسکوپ کا رخ عمارت کی طرف کیا۔ وہ پارکنگ سے اسے عمارت کی چھت کی طرف گھماتی گئی۔

اچانک اس کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہ آگے کی طرف جھک گئی۔ جو کچھ اسے نظر آرہا تھا' وہ اسے زیادہ غور سے دیکھنے کے لئے نگاہوں پر زور ڈالنے لگی۔ یہ اس کا وہم تو نہیں تھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں کرسی سے اٹھ گئی۔ اسکوپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ بیڈ کی طرف جھپٹی اور ریڈیو ٹٹولا۔ ریڈیو لے کر وہ پھر کھڑکی کے پاس آئی۔ اس نے جھٹکے سے ریڈیو کو آن کیا "بابر! بابر!" اس نے پکارا "وہ لوگ چھت پر چڑھے ہوئے ہیں۔ بابر......... بابر......... سن رہے ہو تم؟"

☆————————☆————————☆

کمال رشید کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ چھت پر کچھ لوگ موجود تھے اور وہ دبے پاؤں چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بایاں بازو بے جان ہونے کے باوجود وہ مضطربانہ انداز میں پھرتی سے اٹھا اور اس طرف جھپٹا جہاں طلباء جمع تھے۔ اس کا بے جان بازو ڈیسکوں سے ٹکراتا رہا مگر اس کے پاس اس طرف دھیان دینے کی فرصت نہیں تھی۔

"جاؤ......... نکلو یہاں سے" اس نے تند لہجے میں سرگوشی کی اور کلاس کے سب سے اچھے ایتھلیٹ بشیر کو کھڑکی کی طرف دھکیلا۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ سے بشیر کو سہارا دے کر کھڑکی پر چڑھنے میں مدد دی۔ پردے کی کٹی ہوئی ڈوری لٹک رہی تھی۔ بشیر نے اسے تھاما اور نیچے اترتا چلا گیا۔

"اب تم جاؤ گے رئیس" اس نے کہا۔

"نہیں سر۔ میں آپ کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔"

"بے وز، مت بنو" کمال نے اسے ڈانٹا "تم اپنی اہمیت نہیں سمجھ رہے تمہاری اہمیت تو اب مجرموں پر بھی واضح ہو چکی ہے۔"

"کچھ بھی ہو سر!"

"میں کہتا ہوں' بحث مت کرو" کمال کے لئے اپنی آواز نیچی رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔

تم میری حکم عدولی کر رہے ہو........."

"آخری بار سر۔ وعدہ کرتا ہوں' اس کے بعد آپ کا ہر حکم مانوں گا۔"

"پاگل لڑکے' تمہاری یہاں موجودگی مجرموں کے لئے تقویت اور ہمارے لئے کمزوری کا سبب بنے گی۔ تمہیں میرا حکم ماننا ہی ہوگا۔"

رئیس چند لمحے سوچتا رہا "ٹھیک ہے سر۔ میں مان لوں گا آپ کی بات لیکن آخر میں' کیونکہ یہاں ان لوگوں کو اترنے میں مدد دینے کے لئے بھی کسی کی ضرورت ہے۔ آپ کی حالت ایسی نہیں کہ آپ زیادہ دیر یہ کام کر سکیں۔"

کمال کو اندازہ ہوگیا کہ بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

کپڑے کی رسی کھنچی تو اندازہ ہوگیا کہ بشیر نیچے پہنچ چکا ہے "تو اب کون جائے گا؟" کمال نے پوچھا۔

"اب اشفاق جائے گا" رئیس نے کہا پھر وہ اشفاق کو سہارا دینے لگا۔

کلاس میں لڑکیوں کی تعداد آٹھ تھی۔ انہیں اتارنا سب سے دشوار مرحلہ تھا پھر لڑکیوں میں ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ رونے لگی تھیں۔ رئیس کی تجویز پر کپڑے کی ایک اور رسی لٹکا دی گئی۔ اس کے بعد ہر لڑکی کے ساتھ رئیس خود گیا۔ تاکہ بوقت ضرورت خوف زدہ لڑکی کو گرنے سے بچا سکے۔ ساتویں لڑکی کو نیچے پہنچا کر واپس آیا تو اس نے نازیہ کی طرف دیکھا۔

"یہ تو اس قابل نہیں کہ جاسکے۔" صوفیہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ نعمان اب تم جاؤ۔" رئیس نے کہا۔

کلاس آہستہ آہستہ خالی ہو رہی تھی۔

☆————————☆————————☆

بابر ہڑبڑا کر اٹھا اور اس نے ریڈیو پر چلا کر پوچھا "کتنے ہیں وہ؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی" ریڈیو پر شہناز کا جواب ملا "چار ہیں یا پانچ ہیں۔ میں ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پا رہی ہوں۔"

"دیکھو....... غور سے دیکھو۔ مجھے صحیح تعداد بتاؤ۔"

"پانچ....... ہاں' مجھے پانچ افراد نظر آ رہے ہیں۔"

"وہ ہیں کہاں؟"

"عمارت کے عقبی حصے میں....... اس جگہ سے قریب' جہاں تم ہو۔"

"وہ کیا کر رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے' ان میں سے ایک اس طرف اتر رہا ہے۔ بابر....... عمارت کے گرد سرخ دھبے جابجا نظر آ رہے ہیں۔ میں کیا کروں؟"

"بس تم دیکھتی رہو' اس طرف۔ ضرورت پڑی تو میں تمہیں پھر کال کروں گا۔"

پھر وہ نذیر کا ہاتھ تھام کر اسے کھینچتا ہوا باہر لایا۔ ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر شکور اور شہلا کو بھی پکار رہا تھا۔ وہ چاروں بد قسمت کلاس روم کے باہر اکٹھے ہوئے۔ "سنو....... وہ اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں" بابر نے ہذیانی لہجے میں کہا "وہ اس طرف عقبی حصے میں ہیں۔ وہ اسٹور روم کی طرف گھسنے کی حماقت نہیں کریں گے" اس کی آواز بلند ہو جا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خوف زدہ ہے لیکن اس کے پاس خود پر قابو پانے کی مہلت نہیں تھی۔ پہلی بار اس کا موت سے سامنا ہوا تھا۔ اب اسے پتا چل رہا تھا کہ نہتے اور بے بس لوگوں پر ظلم کرنا اور قوت کا سامنا کرنا دو مختلف باتیں ہیں "وہ تین کلاس رومز اور باتھ رومز کی عقبی کھڑکیوں سے اندر آ سکتے ہیں" اس نے مزید کہا "نذیر....... تمہیں کونے والے زینے اور اس کے سامنے والے کلاس روم پر نظر رکھنی ہے۔ سیڑھیوں معمولی آہٹ سنتے ہی میں بم اڑا دوں گا۔ میں درمیانی زینے پر نظر رکھوں گا اور ہاں....... اپنے اپنے بم اس کلاس روم کے باہر ڈھیر کر دو۔ ہم ختم بھی ہو گئے تو کم بچوں کو مار کر ہی مریں گے۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور درمیانی زینوں کی طرف بھاگا۔

نذیر نے برآمدے کی لائٹ آف کی اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے بڑی احتیاط اور آہستگی سے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور شٹر لگا دیا پھر وہ پیچھے ہٹا اور گھٹنوں کے بل جھک کر پوزیشن سنبھال لی۔ یہاں سے وہ باتھ روم کی عقبی کھڑکی پر نظر رکھ سکتا تھا۔ مشکور نے برابر والے کمرے کے سامنے پوزیشن سنبھال لی تھی۔ شہلا اور بابر

راہداری کے تمام کمروں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ عمارت میں خاموشی چھا گئی تھی۔ بس بد قسمت کلاس روم کی طرف سے عجیب سی آواز آ رہی تھی۔ قدموں کے ادھر ادھر ہونے کی آواز....... اور جیسے کوئی چیز کسی دوسری چیز سے رگڑ کھا رہی ہو۔ نذیر سوچ میں پڑ گیا کہ کلاس میں نہ جانے کیا ہو رہا ہے۔ اس کا اب بھی یہی خیال تھا کہ کلاس روم میں کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ اسی وقت ایک اور آواز نے اسے چونکا دیا۔ راہداری کی مدہم روشنی میں اس نے گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے مشکور کو شاٹ گن فائرنگ پوزیشن میں لاتے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے شاٹ گن گرجی اور نذیر کے جسم میں سرد لہری دوڑ گئی۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور مشکور کی طرف لپکا۔

مشکور نے شاٹ گن سے شیل نکالا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "کھڑکی سے اندر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے اڑا دیا۔"

نذیر نے بھی رائفل تان لی۔ وہ اپنی جگہ واپس چلا آیا تھا۔ کلاس روم کی طرف سے پھر وہی تشویش میں مبتلا کرنے والی آواز آئی پھر ایک اور آواز سنائی دی۔ وہ تیسرے کلاس روم کی طرف لپکا۔ اسی وقت اس نے کلاس روم کی کھڑکی سے کسی کو جسم لچکا کر اندر آنے کی کوشش کرتے دیکھا پھر کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا اور وہ انسانی جسم اندر آ گرا۔ نذیر نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ گولیاں اس شخص کے جسم سے ٹکرائیں تو عجیب سی آواز نکلی تھی اور وہ پیچھے کی طرف گرا تھا۔ اس آواز کو سن کر نذیر کے ذہن میں ایک خیال آیا لیکن صورت حال کی سنگینی کی وجہ سے اس کا شعور اسے گرفت میں نہیں لے سکا۔ اس وقت ایک اور جسم فرش پر گرا۔ نذیر نے اس پر بھی فائر کیا۔ وہ تیسرے پر فائر کرنے ہی والا تھا کہ شاٹ گن گرجی اور تیسرا شخص کھڑکی سے نیچے زمین کی طرف گرتا گیا۔ مشکور بھی اس کی طرف آ گیا تھا۔

مشکور نے شاٹ گن سے تین فائر کیے۔ پھر وہ کمرے میں گھس گیا۔ نذیر وہ منظر ہی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شاٹ گن کا فائر آدمی کا کتنا برا حشر کرتا ہے۔

اندر سے مشکور نے کہا "کم بخت بلٹ پروف پہنے ہوئے ہیں۔ یہ اب بھی زندہ ہیں۔ آؤ....... انہیں کھڑکی سے باہر پھینکنے میں میری مدد کرو۔"

"کھڑکی سے دور رہو۔ ممکن ہے اور بھی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں یہ کام خود ہی کرلوں گا۔"

نذیر دیکھتا رہا۔ مشکور نے زخمی پولیس والے کو غیر مسلح کیا پھر اس نے ایک کو بازو میں اٹھایا اور کھڑکی تک لے گیا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ زخمی پولیس والا کراہ رہا تھا۔ مدہم روشنی میں بھی نذیر دیکھ سکتا تھا کہ شاٹ گن کا بلاسٹ زیادہ تر اس کی بلٹ پروف سے ٹکرایا تھا مگر گولیوں کی بوچھار اس کی کھلی گردن اور اس کے ہیلمٹ سے بھی ٹکرائی تھی۔ وائزر کا شیشہ بھی ٹوٹا تھا۔ اس کا چہرہ اور گردن خون میں نہا گئی تھی۔ مشکور نے اسے اٹھا کر ٹوٹے ہوئے شیشے کے خلا سے باہر دھکیلا اور چھوڑ دیا۔ دوسرے پولیس والے نے مزاحمت کی بلکہ ایک مرحلے پر تو اس نے مشکور کو دھکیل کر گرا بھی دیا تھا لیکن بالآخر مشکور نے اسے بھی اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔

اس لمحے جمنازیم کی چھت سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ نذیر اور مشکور نیچے جھک گئے۔ انہوں نے بھی فائرنگ شروع کردی۔ اچھی خاصی جنگ ہو رہی تھی۔ مسلسل روشنی کرنے والے شیل چھوڑے جا رہے تھے۔ نذیر اور مشکور سینے کے بل گھسٹتے ہوئے کمرے سے نکل آئے۔ باہر وہ دونوں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔

"اب ہم کیا کریں؟" نذیر نے چیخ کر بابر سے پوچھا' جو راہداری کے درمیانی حصے میں زینے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

"انتظار کرو۔"

"لیکن کس کا؟"

"ان کے آئندہ لائحہ عمل کا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔"

فائرنگ جاری رہی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹتے رہے۔ کبھی کوئی بھٹکی ہوئی گولی کمرے یا باتھ روم سے ہو کر کھلے دروازے سے راہداری میں بھی آجاتی تھی۔ وہ لوگ دیوار سے ٹیک لگائے ساکت کھڑے تھے۔ اس ڈر سے کہ کوئی آوارہ گولی انہیں ہی نہ چاٹ جائے۔ نذیر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ پولیس اس طرح فائرنگ کر کے یرغمالیوں کو کیوں خطرے میں ڈال رہی ہے۔

فائرنگ بتدریج کم ہونے لگی۔ بالآخر ختم ہو گئی۔

"یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" نذیر نے چیخ کر بابر سے پوچھا۔

"یہ جاننا اتنا ضروری ہے تو باہر جا کر ان سے خود پوچھ لو" بابر نے تپ کر کہا "لیکن' اس صورت میں تمہارا سر کندھوں پر نہیں رہے گا۔"

"غصہ کیوں کر رہے ہو؟"

"میرا خیال ہے' ایک پولیس والا چھت پر پھنسا رہ گیا تھا۔ وہ اسے عافیت سے اتارنے کے لئے فائرنگ کر رہے تھے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' وہ مزید کارروائی کریں گے؟" نذیر نے پوچھا۔

"وہ میری توقع سے زیادہ بے وقوف ثابت ہوئے ہیں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ دوبارہ حماقت کریں گے۔ اب وہ بیٹھ کر ہمارے ردعمل کے متعلق اندازے لگائیں گے اور پسینے میں نہائیں گے۔"

"تم انہیں کال کر کے دھمکاتے کیوں نہیں؟"

"ابھی نہیں۔ ابھی تو میں فیکلٹی روم جا کر شہناز سے پوچھوں گا کہ کیا صورت حال ہے۔"

بابر راہداری میں جھک کر چل رہا تھا۔ فیکلٹی روم مین ریڈیو موجود نہ ہوتا تو اس وقت وہ ہرگز یہ رسک نہ لیتا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ یہ حقیقت اسے خوف زدہ کر رہی تھی کہ پولیس والوں نے ایک نہایت قابل عمل منصوبہ بنایا بھی تھا اور اس پر اس طرح عمل بھی کیا تھا کہ کامیاب ہو سکتے تھے۔ اگر ریڈیو پر شہناز سے رابطہ نہ ہوتا تو پولیس یقیناً کامیاب ہو جاتی.......... اور اسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وقت پڑنے پر وہ اتنا خوف زدہ بھی ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھی عضو معطل بھی ہو سکتے ہیں۔ گولیوں کی برسات ہوئی تو ان میں سے کسی کو یرغمالی یاد بھی نہیں رہے۔ وہ سب کچھ بھول گئے۔ اگر پولیس اندر آنے میں کامیاب ہو جاتی تو نہ جانے کیا انجام ہوتا اور اسے شہناز سے بھی باز پرس کرنا تھا۔ اس کی نظروں میں آئے بغیر وہ لوگ چھت پر پہنچے کیسے۔ شہناز کو بالکل آخر میں علم کیوں ہوا۔ اس بار تو قسمت نے ان کا ساتھ دیا تھا لیکن قسمت ہمیشہ تو کسی کا بھی ساتھ

نہیں دیتی۔

کمرے کے باہر سے ہی اسے سسکیاں سنائی دیں۔ سسکیوں میں اس کا ہی نام پکارا جا رہا تھا۔ اس نے لپک کر ریڈیو اٹھایا "خاموش ہو جاؤ شہناز۔ ہم سب خیریت سے ہیں" اس نے کہا۔

"میں دس منٹ سے چیخ چیخ کر تمہیں پکار رہی ہوں۔"

"فائرنگ کے شور میں یہاں کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔"

"بابر......... بچے......... میرے مطلب ہے تمہارے یرغمالی طلباء........."

"کیا ہوا طلباء کو؟"

"وہ......... وہ باہر نکل رہے ہیں۔"

بابر نے ریڈیو صوفے پر پٹخا اور تیر کی طرح کمرے سے نکلا۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ یرغمالی ہی تو ان کے تحفظ کی ضمانت تھے۔ وہ ہاتھ سے نکل گئے تو ان کے لئے موت کے سوا کچھ بھی نہیں رہے گا۔ اس بار راہداری میں بھاگتے ہوئے اسے گولیوں کا بھی خوف نہیں تھا۔ اس نے پوری قوت سے کلاس روم کا دروازہ کھولا۔ لائٹ آن کرتے ہی اسے زبردست شاک لگا۔ جو کمرہ کچھ دیر پہلے طلباء سے بھرا ہوا تھا' اب تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ وہ خاموش کھڑا' کمال' صوفیہ اور رئیس کو دیکھتا رہا' جو اپنا کام کرتے کرتے اچانک جم کر رہ گئے تھے۔ روشنی نے انہیں حیران کر دیا تھا۔ نازیہ ایک گوشے میں سمٹی ہوئی بیٹھی تھی' جیسے اسے گردوپیش سے نہ کوئی غرض ہو نہ ہوش۔ بابر خونخوار نظروں سے اس شخص کو دیکھتا رہا' جس کے بارے میں اس سے اندازے کی بدترین غلطی سرزد ہوئی تھی۔ وہ اس کے زخمی چہرے کو بغور دیکھتا رہا۔ کیوں......... آخر اس سے اندازے کی یہ غلطی کیوں سرزد ہوئی۔ وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا' جیسے اس ٹوٹے پھوٹے چہرے پر اسے اپنے سوال کا جواب لکھا مل جائے گا لیکن وہاں تو ان روشن اور ضدی آنکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

کمال نے پلٹ کر کھڑکی سے جھانکا اور بولا "جلدی کرو لڑکو۔ تھوڑا سا وقت ہے تمہارے پاس۔"

بابر سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا "تم سمجھ رہے ہو کہ فتح یاب ہو گئے ہو لیکن ایسا نہیں ہے۔ تم سب تو نہیں نکل سکے نا۔ ہمارا مقصد اب بھی پورا ہو جائے گا۔"

"ہار جیت کی فکر تمہیں ہو گی۔ میرے لئے یہ کوئی کھیل نہیں تھا" کمال نے کہا "مجھے رہ جانے والوں کے متعلق افسوس ہے لیکن میں نے تم سے چوبیس انسانی کھلونے تو چھین لئے۔ ان میں ایس پی جلیس کا بیٹا بھی تھا۔"

بابر بھنا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس نے شاٹ گن کا رخ کمال کے چہرے کی طرف کر دیا۔ وہ اس بیماری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا تھا' جو اس کے مکمل اور بے داغ منصوبے کو تقریباً موت سے ہم کنار کر چکی تھی۔ وہ ایک لمحے کو رکا۔ اسے افسوس تھا کہ وہ اسے توڑ نہیں سکا۔ وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی رد عمل......... خوف کی کوئی علامت......... کچھ بھی نہیں! وہ غصے اور بے بسی کی آگ میں جھلس رہا تھا۔

خیر......... اب اسے بھی کوئی پرواہ نہیں۔ اس نے گن کو کندھے پر ٹکایا اور ٹریگر پر انگلی رکھ کر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اس نے نذیر کو کمرے میں داخل ہوتے اور خود پر چھلانگ لگاتے نہیں دیکھا۔ بس اسے اتنا احساس تھا کہ فائر کے وقت کمال رشید کا چہرہ شاٹ گن کی نال کے سامنے نہیں تھا۔ وہ فرش پر گرا۔ اس وقت وہ غصے کا آتش فشاں بن چکا تھا۔

☆============☆============☆

ایس پی جلیس فون پر ہوم سیکریٹری سے جھاڑ سن چکا تھا۔ یہ اسے اب پتا چلا تھا کہ وزیراعظم نے واردات کی خبر ملتے ہی ٹی وی پر اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ حکومت دہشت گردوں کے مطالبات تسلیم کر کے دہشت گردی کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گی لیکن آٹھ گھنٹے بعد انہوں نے بیان دیا کہ انسانی جانوں کو خطرے سے بچانا زیادہ ضروری ہے۔ لٰہذا دہشت گردوں سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ دوسری طرف وزیرداخلہ اپنا غیر ملکی دورہ مختصر کر کے واپس آ چکے تھے اور کسی بھی وقت مری پہنچنے والے تھے۔

اور اب تھکے ہارے مضمحل جلیس احمد کو روشنیوں' کیمروں اور صحافیوں کا سامنا کرنا تھا۔ وہ کیمرے سے نظریں چرا رہا تھا۔ پریس کانفرنس سے وہ ویسے بھی گھبراتا تھا اور پھر یہ پریس کانفرنس تو تھی بھی خوفناک۔ وہ تو صحافیوں کو ٹال دیتا مگر اوپر کے احکامات تھے کہ اسے صحافیوں کا سامنا کرنا ہے۔

اب یہ محض پولیس ایکشن نہیں رہا تھا۔ بلکہ ایک بڑے سیاسی کھیل میں تبدیل ہوچکا تھا۔ اس سطح پر وہ بہت چھوٹا آدمی تھا۔ اسے جو لائن دی گئی تھی۔ اسے اس کے مطابق بولنا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی بعید ازامکان نہیں تھا کہ گورنمنٹ کے حامی صحافیوں کو سوالات کے سلسلے میں بھی کوئی لائن دی گئی ہو۔

مائیکروفون اسٹیڈیم کے ایک اسٹینڈ میں سیٹ کیا گیا تھا۔ اس نے پریس کانفرنس کا آغاز کیا "آپ لوگ جانتے ہیں کہ کل دوپہر ایک بجے چار دہشت گرد اسکول میں داخل ہوئے۔ انہوں نے فائر الارم بجاکر اسکول کو خالی کرا لیا۔ اس سے پہلے وہ ٹاپ فلور کے ایک کلاس روم پر قابض ہو چکے تھے۔ اس کلاس میں موجود طلباء اور دو ٹیچرز کو انہوں نے یرغمال بنالیا۔ ابھی ہم یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ دہشت گردوں کے سیاسی مقاصد بھی ہیں یا نہیں۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ انہوں نے بھاری زرتاوان کا مطالبہ کیا ہے۔ ہمارا مفروضہ ہے کہ ان کا مقصد صرف زرتاوان کا حصول ہے۔ آج صبح دو بجے ہم نے ایک کارروائی کی' جس کا مقصد دہشت گردوں پر قابو پانا اور یرغمالیوں کو آزاد کرانا تھا۔ یہ کارروائی جزوی طور پر کامیاب رہی۔ تین طلباء اور دو ٹیچرز کے سوا تمام یرغمالی ہماری فائرنگ کے دوران عمارت سے بخیروعافیت نکل آئے۔ ہم تیسری منزل تک پہنچنے میں تو کامیاب ہوگئے تھے لیکن ان پر قبضہ نہ کرسکے۔ ہمیں پسپا ہونا پڑا۔ میں اس بات پر زور دوں گا کہ صورت حال اب بھی بے حد تشویش ناک ہے۔ دہشت گرد ہر طرح کے اسلحے سے لیس ہیں اور ان کے قبضے میں پانچ یرغمالی بھی ہیں۔ شکریہ۔"

اس کا بس چلتا تو اب اپنے آپریشن بوتھ کی پناہ گاہ کا رخ کرتا لیکن ابھی اسے اس دشوار مرحلے سے بھی گزرنا تھا۔ اسے سوالوں کے جواب دینا تھے۔ وہ سر جھکائے سوال کا منتظر تھا۔

"اس کارروائی میں جانی نقصان کتنا ہوا؟"

"دو جوان جاں بحق اور دو زخمی ہوئے۔"

"اور ویسے اب تک کتنا نقصان ہوا ہے؟"

"تین افراد جاں بحق ہوئے اور دو زخمی..........." پھر اس نے وضاحت کی۔ "صبح دہشت گردوں کے ہاتھوں ایک ٹیچر ہلاک ہوا تھا باقی نقصان پولیس کے جوانوں کا ہوا ہے۔"

"بس؟"

"باہر آنے والے طلباء نے بتایا کہ اندر بھی ایک ٹیچر زخمی ہے۔"

"زخمیوں کا کیا حال ہے؟"

"پولیس کے دونوں جوانوں کی حالت تشویش ناک ہے۔ البتہ اسکول میں جو ٹیچر زخمی ہے' اس کی حالت اتنی خراب نہیں ہو گی۔ اس لئے کہ اس نے طلباء کو اسکول سے نکلنے میں مدد دی ہے۔ بہرحال زخمی وہ ہے۔ اس کے گولی لگی تھی۔"

"آپ نے عمارت پر قبضہ کرنے کی کارروائی کیوں کی۔ جبکہ آپ جانتے تھے کہ اس سے یرغمالیوں کی جانیں خطرے میں پڑ سکتی ہیں؟" ایک صحافی نے سوال کیا۔

جلیس نے جان لیا کہ اب سخت مرحلہ شروع ہو رہا ہے "یہ میرا انفرادی فیصلہ تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ کارروائی کا اچانک پن دہشت گردوں کو حیران کردے گا اور ہم کامیاب ہو جائیں گے۔"

"لیکن آپ کا منصوبہ ناکام ہوگیا۔"

"اس کا جواب ہاں بھی ہے اور نہیں بھی۔ ہم نے دہشت گردوں کی بے خبری میں پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ انہیں بالکل آخری لمحوں میں پتا چلا۔ اس اندازے کی تصدیق بچ نکلنے والے طلباء نے کی ہے۔ انہیں چھت پر چڑھنے والے جوانوں کی آہٹیں سنائی دے گئی تھیں۔ بس پھر انہوں نے اپنا دفاع منظم کرلیا۔"

"انہیں آپ کے آدمیوں کی بلڈنگ میں موجودگی کا شبہ کب ہوا؟"

"حملے سے چند لمحے پہلے۔ انہوں نے لائٹیں آف کر دی تھیں۔ اس سے مجھے

اندازہ ہو گیا کہ انہیں شک ضرور ہو گیا ہے۔"

"تو پھر آپ نے کارروائی روکی کیوں نہیں۔"

"میں نے یہ حکم دیا تھا۔"

"تو پھر کیا ہوا.........؟"

"اسکول کی چھت پر پہنچنے والے گروپ کے لیڈر کا واکی ٹاکی جمنازیم کی چھت پر رہ گیا تھا۔ رابطہ ممکن نہیں تھا۔"

"حملے میں کوئی دہشت گرد بھی زخمی ہوا؟"

"اس کا ہمیں علم نہیں۔"

"آپ لوگوں نے اتنی فائرنگ کی۔ آپ کو یہ خوف نہیں تھا کہ اس سے کوئی لڑکا بھی زخمی ہو سکتا ہے۔"

اس طرح کے ناقدانہ سوالات جلیس کے لئے پریشان کن تھے۔ اس نے کہا "ہم نے اسکول کی چھت پر پھنسے ہوئے اپنے ایک آدمی کو کور دینے کے لئے فائرنگ کی تھی۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ طلباء فرار ہو رہے ہیں۔ انہیں بھی زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کرنا تھا۔ دوسرے کلاس روم کی پوزیشن ایسی ہے کہ ہمیں یقین تھا کہ کوئی بھٹکی ہوئی گولی بھی اس طرف نہیں جائے گی۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ دہشت گرد کون ہیں؟"

"بچ نکلنے والے طلباء سے ہمیں تین نام معلوم ہوئے ہیں لیکن اس سے زیادہ ابھی تک کچھ اور معلوم نہیں ہو سکا ہے۔"

"ان کے نام بتائیں گے؟"

"فی الوقت تو یہ ممکن نہیں۔"

"کیا وہ مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے ہیں؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بہرحال یہ طے ہے کہ وہ خطرناک لوگ ہیں۔ جو کچھ سنا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا لیڈر نہایت درجے اذیت رساں ہے۔ اس کے ایک ساتھی نے اسکول کے پی ٹی انسٹرکٹر کو شوٹ کر دیا یعنی ان کے نزدیک انسانی جانوں

کی کوئی اہمیت نہیں" جلیس نے ایک لمحے توقف کیا پھر بولا "بس حضرات۔ فی الوقت میں آپ کو اور کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"چوتھے کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں بتایا۔"

"اس کے بارے میں بس اتنا معلوم ہے کہ وہ عورت ہے۔"

"آپ کے خیال میں اس جرم کے سیاسی محرکات نہیں ہیں؟"

"میرے خیال میں اس کے لئے ایک ہی مناسب لفظ ہے............ دہشت گردی"

جلیس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا "وہ یرغمالیوں کے ساتھ بے رحمانہ برتاؤ کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ بھی پتا چلا ہے کہ انہوں نے ایک بچی کی آبرو ریزی کی ہے۔ میرے نزدیک وہ بدترین قسم کے مجرم ہیں، جو آسانی سے دولت مند بننا چاہتے ہیں۔ جن کے نزدیک انسان اور انسانیت کی کوئی وقعت نہیں۔ ان کا انداز بھی دہشت گردوں والا ہے اور رویہ بھی۔ انہیں میں انسانی کیچڑ قرار دوں گا.......... غلیظ کیچڑ۔"

"ہمیں بچ نکلنے والے طلباء سے بات کرنے کا موقع کب ملے گا؟"

"ہم نے ان سے پوچھ گچھ کی ہے اور انہیں ان کے گھر بھیجا جا رہا ہے۔ یہ معاملہ نمٹنے کے بعد ہی آپ ان سے بات کر سکیں گے۔"

"اس وقت آپ کا دہشت گردوں سے رابطہ ہے؟"

"نہیں۔"

"گویا آپ کو نہیں معلوم کہ اس وقت عمارت میں کیا ہو رہا ہے؟"

"نہیں۔ میں نے کئی بار انٹرکام پر کال کیا لیکن وہ کال ریسیور نہیں کر رہے ہیں۔"

"اب آپ کیا کریں گے؟"

"انتظار" جلیس نے کہا۔ اب وہ سوالات سے بیزار ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سلسلے کو فوری طور پر نہ روکا گیا تو ختم ہی نہیں ہو گا "حضرات........ باقی سوالوں کے جواب آپ کو شام کو ملیں گے۔"

"ایک اور سوال" ایک صحافی نے آگے آتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ آپ کا اکلوتا بیٹا بھی یرغمالیوں میں شامل ہے؟"

اس کے فوراً بعد صحافیوں میں بڑبڑاہٹیں ابھریں۔ جلیس کو امید ہو چلی تھی کہ فی الحال یہ بات دب گئی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ "وہ یرغمالیوں میں شامل تھا" اس نے کہا اور حصار توڑ کر نکلنے لگا۔

"کیا آپ کی کارروائی کا محرک یہی حقیقت تھی؟"

جلیس پلٹا۔ اس نے ہجوم میں سوال کرنے والے کو تلاش کیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "ہرگز نہیں۔"

سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی مگر وہ انہیں نظرانداز کر کے اپنے بوتھ کی طرف چل دیا۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔ پولیس کو کتنا غلط سمجھا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ دو جوان زندگی گنوا بیٹھے تھے لیکن ۲۴ انسانی جانیں بچا بھی تو لی گئی تھیں۔ ان میں اس کا بیٹا بھی تھا مگر اس نے اس کے لئے کوئی خصوصی کوشش نہیں کی تھی پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس کریڈٹ کا مستحق نہیں۔ کریڈٹ تو اس ٹیچر کو جاتا ہے' جس نے بچوں کو فرار کرایا۔ اگر وہ یہ قدم نہ اٹھاتا تو کیا ہوتا؟ یہ وہ سوال تھا' جس کا وہ جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔

بوتھ میں داخل ہو کر وہ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور گہری سانسیں لینے لگا۔

"سخت وقت گزار کر آئے ہو؟" پرنسپل جمیل الرحمٰن نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

جلیس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سگریٹ کے کش لے رہا تھا "اور سگریٹ ہو گی آپ کے پاس؟"

"ضرور۔ بلکہ کافی بھی لو۔ تھرموس میں موجود ہے۔"

"آپ گھر نہیں گئے؟"

"گیا تھا۔"

جلیس نے اس کی دی ہوئی سگریٹ سلگائی "لیکن نیند نہیں آئی آپ کو؟"

"میں نے ریڈیو پر بچ نکلنے والے طلباء کے متعلق سنا تھا۔"

"بیشتر نکل آئے۔ میرا خیال ہے کمال صاحب نے جیسے ہی یہ بات سمجھی کہ ہم نے آپریشن شروع کر دیا ہے تو انہوں نے موقعے سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے طلباء کو باہر

دھکیل دیا۔"

"میرے ٹیچرز کی کیا کیفیت ہے؟" جمیل الرحمٰن نے پوچھا۔

"وہ دہشت گردوں کی نفرت کا نشانہ بن رہے ہیں۔"

"اوہ............"

"اور طلباء نے جو کچھ بتایا ہے' اس کی روشنی میں لگتا ہے کہ کمال رشید اسٹیل کا بنا ہوا ہے۔ جو کچھ دہشت گرد اس کے ساتھ کر چکے ہیں۔ اس کے بعد اسے زندہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔"

"بہت زخمی ہے وہ؟"

"جی ہاں اور اس کے باوجود اس نے کارنامہ انجام دیا ہے۔"

"وہ سابق فوجی ہے اور اسکول کے بہترین ٹیچروں میں سے ہے" جمیل الرحمٰن نے کہا "اور ان دنوں وہ بہت پریشان تھا۔"

"پریشانی میں تو وہ اب ہے" جلیس نے کہا "اور مجھے یقین نہیں ہے کہ ہم اسے بعافیت نکال سکیں گے۔ کل رات ہم نے مجرموں کو ڈرایا ہے۔ اب وہ عمارت میں زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔"

"تو پھر تم کیا کرو گے؟"

"سوچتے تو رہیں گے لیکن اب کچھ کر گزرنے کا امکان کم ہے۔ یرغمالی اب پوری طرح مجرموں کے رحم و کرم پر ہیں۔"

☆-----------☆-----------☆

بابر کھڑکی کے پاس کھڑا پردوں کی درزوں سے باہر اسٹیڈیم کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ نذیر دروازے کے پاس رائفل کو ریڈی پوزیشن میں لئے کھڑا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا کہ کسی بھی وقت بابر گھومے گا' اس کی شاٹ گن گرجے گی اور اسے اس مداخلت کی سزا ملے گی۔ اس نے ماسٹر کی جان ایک بار بچائی تھی لیکن وہ دوبارہ یہ ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آئندہ ایسا ہوا تو بابر اسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔

بدستور کھڑکی سے جھانکتے ہوئے بابر نے کہا "ان لوگوں کو فیکلٹی روم میں لے

جاؤ۔ اب ہر لمحے انہیں نظروں کے سامنے رکھنا ہو گا۔"

وہ سب دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ اچانک بابر نے کہا "کمال رشید یہیں رکے گا۔"

نذیر دروازے پر ٹھٹکا۔ اس نے پلٹ کر بابر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر وہ دوسروں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ صوفیہ دروازے پر رکی "اسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔"

بابر نے سر گھما کر اسے دیکھا اور غرایا "مشکور.......... لے جاؤ اسے یہاں سے۔"

مشکور نے صوفیہ کو باہر دھکا دیا اور باہر جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

بابر اور کمال کچھ دیر ایک دوسرے کو گھورتے رہے پھر بابر بڑے ڈیسک کی طرف بڑھا اور آرام سے بیٹھ گیا۔ اس نے شاٹ گن ڈیسک پر رکھ دی اور بولا "اٹھو مسٹر کمال۔"

کمال بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ یہ پیشکش ایک نعمت تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

بابر کی انگلیاں چند لمحے شاٹ گن کے ٹریگر سے کھیلتی رہیں پھر اس نے کہا "میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔"

کمال نے اسٹوڈنٹ ڈیسک سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں "میرا خیال ہے' اب تمہاری نظروں میں' میں بزدل نہیں رہا ہوں گا۔"

"میں تمہیں اس سے زیادہ کریڈٹ دوں گا۔ تم حیران کر دینے والے آدمی ثابت ہوئے ہو۔ تم بیشتر عام لوگوں جیسے کمزور ہو لیکن کمزور بہرحال ہو ضرور۔"

"سب سے بڑی کمزوری موت کا خوف ہے" کمال نے سکون سے کہا "جس کا یہ خوف نکل جائے' وہ کمزور نہیں رہتا۔"

بابر کی انگلیاں بدستور ٹریگر سے کھیل رہی تھیں "تو تم یہ فلسفہ پڑھاتے ہو اپنی کلاس میں۔"

"نہیں۔ یہ چیزیں کلاس میں نہیں پڑھائی جا سکتیں۔ یہ تو آدمی خود اپنے اندر

دریافت کرتا ہے۔ میں کلاس میں طلباء کی ذہانت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہوں زندگی کی سچائیاں تو بعد کی چیز ہیں۔ ذہن کی صحیح تربیت کر دی جائے' اسے صیقل کر دیا جائے تو سچائیاں خود سمجھ میں آنے لگتی ہیں مگر مناسب وقت پر۔"

بابر کی انگلی ٹریگر پر جم گئی "میں تمہیں مارنے والا ہوں" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے" کمال نے بے پروائی سے کہا۔

"اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی تمہیں میری بات پر یقین نہیں آتا۔"

"توقع تو مجھے یہی ہے لیکن تمہاری بات پر یقین نہ کرنے میں ہی میری بہتری ہے اور پھر میں ایمان رکھتا ہوں کہ زندگی اور موت خدا کے اختیار میں ہے۔"

میں اس معاملے کو ابھی' اسی وقت اور یہیں نمٹا دینا چاہتا ہوں لیکن میرے خیال میں ابھی تم پکے ہوئے پھل کی طرح نہیں ہو کہ تمہیں توڑ کر خوشی ہو۔ ابھی تو لگتا ہے کہ تم نے مجھ سے خوف زدہ ہونا بھی نہیں سیکھا۔"

مجھے یاد ہے کہ تمہیں دوسروں کو ایذا پہنچا کر خوشی ہوتی ہے اور تمہیں ایذا دینے کے طریقے بھی آتے ہیں۔"

"میں جانتا تھا کہ تمہیں یہ بات یاد ہو گی۔"

کمال تھکے تھکے انداز میں ہنسنے لگا "یاد کیسے نہیں۔ یہ میرا بازو کا سوراخ بھولنے دے گا؟"

"مجھے خوشی ہے کہ ابھی تم میں زندہ دلی باقی ہے" بابر نے بے رحمی سے کہا "ویسے یہ تو بتاؤ کہ اس صورت حال میں تمہیں دلچسپی اور محظوظ ہونے کا کون سا پہلو نظر آتا ہے۔"

"میری ہنسی کا غلط مطلب نہ لو۔ مجھے یہ صورت حال دلچسپ نہیں لگتی۔ اگر یہ ساعت تمہاری حکمرانی کی ہے.......... اور اگر ایسی چند اور ساعتیں تمہیں ملتی ہیں تو انہیں اچھی طرح انجوائے کر لو کیونکہ وقت ایک سا کبھی نہیں رہتا۔ کبھی نہ کبھی وقت کی زد پر تم بھی آؤ گے.......... میرے نہ سہی' کسی اور کے ہاتھوں.........."

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ گویا تم سمجھ سکتے ہو کہ میرا کام کتنا مشکل ہے۔"

"اس اسکول میں یہ جنگ جیت لینا کوئی بڑی بات تو نہیں۔" کمال نے طنز کیا۔

"یہ تو محض نکتہ آغاز ہے۔"

"کمزور لڑکوں کو خوف زدہ کرکے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟"

"تمہیں میرے عزائم کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ میں تو اس ملک کو تباہ وبرباد کرنے کے ارادے سے نکلا ہوں۔"

"لیکن کیوں؟"

"اس لئے کہ مجھے ایک یہی کام آتا ہے۔ میری فطرت میں ہی تخریب ہے اور پھر اس ہنر کے ذریعے میں دولت بھی کما سکتا ہوں۔ پانچ کروڑ روپے کم تو نہیں ہوتے" بابر نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا "ایک بات بتاؤ۔ تم مجھے روکنے کے لئے کیا کرو گے؟"

"میں تمہیں کیا روکوں گا۔ یہ سوال تم باہر والوں سے پوچھو۔" کمال نے اسٹیڈیم کی جانب کھلنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"ان کے لئے میرے پاس حیرتیں ہی حیرتیں ہیں۔"

"ویسے مسٹر بابر' اپنے اور میرے معاملے میں یہ امید نہ رکھنا کہ میں خاموشی سے لڑھک کر مرجاؤں گا۔ کاش نوبت یہاں تک نہ پہنچے۔ ورنہ تم سے جنگ میں مجھے تم جیسا بننا پڑے گا اور یہ بات سوچ کر ہی میرا جی متلانے لگتا ہے۔ میں اور تم جیسا........."

بابر اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ "یہی تو تمہاری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ دہشت گردی سے لڑنے کے لئے دہشت گردی ضروری ہے اور تم دہشت گرد نہیں بن سکتے" وہ اس کے سامنے رک گیا "ہمارے درمیان خوش گوار گفتگو رہی مگر اب ہمیں دوسروں کی طرف چلنا چاہئے۔"

کمال ڈیسک پر ہاتھ ٹکا کر اٹھنے لگا۔

"لیکن اس سے پہلے میں ایک تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ عملی تبصرہ۔" بابر نے کہا اور کمال کے حلق پر شاٹ گن کی بیرل ماری۔ کمال نیچے گرا۔ اسی لمحے بابر کی لات اس کی ناف پر لگی۔ اس کے حلق سے بے ساختہ کراہ نکل گئی "اب سے مرنے تک تمہیں ایسی ہی اذیتیں سہنی پڑیں گی۔ آخر میں تم خواہش کرو گے کہ تمہیں موت آجائے۔ تم مجھے

نہیں روک سکتے۔ تم پہلے ہی میرے سامنے سر اٹھانے کی مہلک غلطی کرچکے ہو۔ اس کی سزا تم بھگتتے رہو گے۔" اس نے کمال کے پیٹ میں ایک اور ٹھوکر ماری "تم پچھتاتے رہو گے کہ نذیر نے تمہیں مرنے سے کیوں بچایا۔" اس بار ٹھوکر کمال کے منہ پر لگی۔ اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا پھر اسے ہوش نہ رہا۔

☆------------☆------------☆

اس کا جسم مڑا تڑا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ انہیں کھول نہیں سکتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا جسم جیسے مائع کا روپ اختیار کرگیا ہے اور اسے کسی جگ......... کسی پیالے میں بھردیا گیا ہے۔ دنیا جیسے ایک شٹر گرائے جانے سے کسی دکان کی طرح اس پر بند ہوگئی تھی۔ ذہن کا جیسے جسم سے......... اور یوں درد سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو محسوس کرنے' تصور میں اسے کوئی شکل کوئی ساخت دینے اور حرکت دینے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش اس کی حالت کے پیش نظر بہت بڑی تھی۔ خیال کے زور پر ایک بہت بڑا پہاڑ تخلیق کرنا اور پھر خیال کی قوت سے ہی اسے مٹا دینا اس کوشش کی نسبت بہت آسان تھا۔

اس کے اندر ہتھیار ڈالنے......... مزاحمت ترک کرنے کی ترغیب بہت طاقت پکڑ گئی تھی۔ اب جو ہو سو ہو۔ زیادہ سے زیادہ موت آجائے گی اسے۔ تو ویسے بھی بابر اسے قتل کرنے کا عہد کرچکا تھا۔ تو جب موت یقینی ہے تو پھر کسی چیز کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ شادی......... آبائی زمین پر گھر بسانا اور نسل بڑھانا......... اور بچوں کو پڑھانا۔ یہ سب کسی اور......... بہت دور کی دنیا کی باتیں تھیں۔ اس وقت تو وہ جس صورت حال میں زندہ تھا' وہ جنگل کے قانون والی تھی۔ زیادہ طاقتور......... زیادہ فٹ آدمی جی سکتا تھا اور فٹنس کے اعتبار سے اس کی پوزیشن بہت ہی زیادہ کمزور تھی پھر بابر ایک بھیڑیا تھا۔ جبکہ وہ ایک شریف اور نفیس آدمی تھا وہ اخلاقی ضابطوں کے تحت زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ وہ بھیڑیے کے مقابلے میں بھیڑیا نہیں بن سکتا تھا۔ یعنی اس کا اور بابر کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ اس لئے تو اس کا یہ حشر ہوا تھا۔ دوسری طرف تسکین کا سامان بھی تھا۔ بدترین صورت حال میں بھی وہ تہی دامن تو نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے بیشتر شاگردوں کو بچانے میں

کامیاب رہا تھا اور اس نے بدی کے سامنے سر بھی نہیں جھکایا تھا۔ جو کچھ بھی ایسی صورت حال میں کیا جاسکتا ہے' اس نے کیا تھا۔

اچانک اسے اپنے والد کا خیال آگیا۔ وہ کہتے تھے.......... زندگی جدوجہد کا نام ہے.......... ہتھیار ڈالنے کا نہیں۔ جدوجہد سے محروم زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔

اس نے سوچا' جب تک اس کا دماغ اور جسم کمزور دھاگے سے بندھے ہوئے ہیں' وہ خود کو تھکن اور اذیت کا عادی بنانے کی کوشش کرے گا۔ ان دونوں کمزوریوں کو زندگی کے اس ڈرامے میں چھوٹے اور ثانوی کردار دے گا اور جدوجہد جاری رکھے گا۔ وہ زخمی اور درماندہ جسم کے ہر احتجاج کو نظرانداز کردے گا۔ اسے چیلنج کا بہادری سے سامنا کرنا ہے۔

یہ سوچتے سوچتے وہ سوگیا۔

بابر ٹہلتے ٹہلتے رکا اور اس نے سوئے ہوئے کمال رشید کو دیکھا۔ وہ ابھی تک دو متضاد خواہشوں کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔ ایک خواہش کہتی تھی.......... اس مسلمان کو ابھی ختم کردے۔ موت سے خوف زدہ نہ ہونا اس کی طاقت ہے.......... اور یہ طاقت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ دوسری خواہش کہتی تھی.......... نہیں' ابھی نہیں۔ ابھی اسے اذیتیں پہنچا۔ اس کا دل پہلی خواہش کا اسیر تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' اس شخص کو قتل کرنا دشوار تر ہوتا جارہا تھا۔ وہ ان کی ضرورت بنتا جارہا تھا۔ اب یرغمالیوں کی تعداد اتنی کم ہوچکی تھی کہ ان میں سے کسی کو ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ ایک ضروری تالے کی چابی کی سی حیثیت اختیار کرتا جارہا تھا۔ دوسرے یرغمالی اس پر انحصار کرتے تھے۔ وہ نہ رہا تو شاید باقی لوگ دہشت ہی سے مرجائیں گے۔ وہ ان کے لئے امید کی علامت تھا اور یرغمالیوں کی زندگی بہت اہم تھی۔ اس لئے کہ وہ ان کی اپنی زندگی کی ضمانت تھے۔

یہ سوچ کر اس کا خون کھولنے لگا۔ جب وہ پہلی بار کلاس روم میں داخل ہوا تو یہ شخص کمال رشید کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر اب وہ بڑھتا.......... پھیلتا جارہا تھا۔ ہر توہین اور ہر تشدد کے بعد وہ پہلے سے زیدہ مضبوط اور طاقتور محسوس ہونے لگتا تھا۔ بابر کو اپنے اودر

ہونے کا احساس ہونے لگا۔ شاید اس نے اپنے ہتھیار.......... غصہ' دھمکیاں' تشدّد اور موت کی دہشت.......... ضرورت سے زیادہ استعمال کرلئے تھے۔ اس لئے اب اسے ان کے استعمال پر اپنا من پسند ردعمل نہیں مل رہا تھا۔ اس نے موت کو اس سخت جان دشمن سے محض ایک سانس کے فاصلے پر لاکھڑا کیا تھا مگر وہ اپنی جگہ ڈٹا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے کی پرچھائیں تک نہیں لرزی تھی۔ نذیر نے مداخلت کرکے اسے بچالیا تھا.......... اور سچ یہ ہے کہ اچھا ہی کیا تھا۔ کیونکہ اس شخص کی اپنی ایک اہمیت تھی۔ تاہم بابر کو یہ اطمینان تھا کہ دیر سے سہی' اس کی خواہش پوری ضرور ہوتی۔ آخر میں وہ اس کے ہاتھوں بہرحال مارا جائے گا۔

فیکلٹی روم کے دروازے پر کھڑے ہوئے نذیر کو سوتے ہوئے اس شخص پر رشک آرہا تھا۔ وہ بابر کے بے داغ منصوبے کی واحد کمزوری بن گیا تھا۔ اور وہ کیسا خوش نصیب تھا کہ بے فکری اور اطمینان سے سورہا تھا جبکہ وہ چاروں' دن ہو یا رات' باری باری صرف چار گھنٹے سوسکتے تھے۔ خود اسے ابھی تک ایک گھنٹے سے زیادہ آرام کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔ سو اب اس کے ہاتھ پاؤں ست پڑنے لگے تھے اور دماغ پر دھند سی چھارہی تھی۔ اس وقت دوپہر کا ایک بجنے والا تھا اور وہ جانتا تھا کہ ڈیڈ لائن تک تو اسے آرام کی مہلت مل نہیں سکتی۔ بلکہ حفاظت سے نکل جانے تک وہ نہیں سوسکتا۔ اس نے حساب لگایا۔ ابھی کم ازکم چودہ گھنٹے اسے نیند نہیں مل سکتی۔ اس خیال نے اس کی تھکن میں اور اضافہ کردیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر جابیٹھا۔ تینوں لڑکے صوفے پر گہری نیند سو رہے تھے۔ صوفیہ ایک کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ وہ بار بار جھٹکے سے بیدار ہوتی اور پھر دوبارہ اونگنے لگتی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس کی جگہ ہوتا تو وہ بھی اسی طرح سوتا۔ اس صورت حال میں کون سوسکتا ہے۔ سوائے لڑکوں کے.......... انہیں صورت حال کی سنگینی کا پوری طرح ادراک تو نہیں تھا اور پھر اس عمر کی نیند ایسی ہی ہوتی ہے کہ آدمی کانٹوں پر بھی بے خبر سوجائے۔ اس نے سوچا' کاش میں بھی ایسا ہی ہوتا۔ سب کچھ بھول بھال کر میٹھی نیند سوجاتا۔

اس نے سر گھما کر کمال رشید کو دیکھا۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا تھا۔ اب وہ' وہ آدمی نہیں تھا۔ جسے اس نے ابتدا میں دیکھا تھا۔ بلکہ اس میں اس شخص کی جھلک بھی نہیں تھی۔ اس کا کوٹ اور قمیض کندھے پر سے پھٹی ہوئی تھی اور جابجا خون کے دھبے تھے۔ ناک متورم تھی اور ایک طرف جھک گئی تھی۔ نتھنوں کے گرد خون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ بائیں رخسار پر نیل بھی پڑا ہوا تھا اور کٹ بھی تھا۔ پہلی نظر میں اس نے سوچا تھا کہ کاش وہ بھی اس شخص جیسا ہوتا۔ خوبرو' خوش لباس اور باوقار' لیکن اب تو اسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ کوٹ کے نیچے اب سوئٹر نہیں پہنے ہے۔ اس نے صوفیہ کی طرف دیکھا۔ ماسٹر کا سوئٹر اب وہ پہنے ہوئے تھی۔ سوئٹر کے بائیں کندھے پر گولی کا سوراخ بھی تھا اور خون بھی لگا تھا۔ نذیر کو حیرت ہوئی۔ اس حال میں ماسٹر نے یہ سوئٹر کیسے اتارا ہوگا ماسٹرنی کے لئے! واقعی.......... آدمی حوصلے والا ہے۔ اچانک نذیر کو اس کے حال پر افسوس ہونے لگا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے اس نے اس شخص کی جان بچائی تھی۔ اس لئے نہیں کہ وہ اسے پسند کرتا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ اس کے خیال میں یہ ضروری تھا۔ اس نے بے حد سمجھ داری سے کام لیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ شخص زیادہ دیر بچ نہیں سکے گا۔

بابر بلڈنگ کا جائزہ لے کر واپس آگیا۔ اس نے اپنے لئے ایک پیالی میں کافی انڈیلی اور نذیر کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ اس سے قطع نظر وہ تروتازہ لگ رہا تھا۔ نذیر نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اسے غیر معمولی تاثر نظر آیا "کیا بات ہے' کچھ پریشان لگ رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

بابر نے کافی کا گھونٹ لیا۔ اس کے چہرے پر سکون پھیل گیا "سب کچھ کنٹرول میں ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"یہ بھی اچھا ہے کہ طلباء کم رہ گئے ہیں۔ ہم یہاں ان پر زیادہ بہتر طور پر نظر رکھ سکتے ہیں" نذیر بولا۔

"ہمیں وہاں ان پر بہتر طور پر نظر رکھنا چاہئے تھی۔ بڑی تعداد ہماری طاقت تھی۔"

"وہ صورت حال ایسی تھی کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔"

"نہیں۔ ہم نے انہیں بہت دیر تنہائی فراہم کر کے غلطی کی" بابر نے تلخ لہجے میں کہا "یوں کمال کو انہیں تیار کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ نہ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔"

"لیکن جو کچھ ہوا' وہ ہمارے لئے بہتر ہوا ہے۔" نذیر نے کہا "جانتے ہو' یہ جو لڑکا ہے رئیس' یہ وفاقی وزیر داخلہ کا بیٹا ہے۔"

بابر سنبھل کر بیٹھ گیا "اوہ.......... تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"خود ہی ڈینگ مار بیٹھا تھا۔ ماسٹر نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی تھی۔"

"بس تو پھر پریشان ہونے کی کوئی بات ہی نہیں۔ سمجھ لو' ہم یہ کھیل جیت گئے۔"

اسی وقت انٹر کام کا بزر چیخا۔ پولیس کی کارروائی کے بعد سے یہ پانچویں کال تھی۔ بابر چند لمحے انٹر کام کو گھورتا رہا پھر اس نے ریسیور اٹھایا۔ "یس ذلیل ٹلے!" اس نے کہا۔

"بہت تپے ہوئے لگ رہے ہو؟" دوسری طرف سے جلیس نے کہا "کیا صورت حال اچھی نہیں معلوم ہو رہی ہے؟"

"نروس تو تم معلوم ہو رہے ہو۔ میں تو ۲۴ جانوں کا بوجھ کم ہونے پر خوش ہوں۔ میرے لئے سنار کی سو کے مقابلے میں لوہار کی ایک زیادہ تسلی بخش ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے قبضے میں ایک وزیر زادہ بھی ہے۔ وہ تو ہزار یرغمالیوں سے بڑھ کر ہے۔"

جلیس پریشان ہوگیا۔ تاہم اس نے بے پروائی سے کہا "موت تو وزیروں کو بھی آتی ہے اور بادشاہوں کو بھی۔ اس معاملے میں امیر غریب برابر ہیں۔"

"درست لیکن ایک عام لڑکے کے مقابلے میں وزیر کے بیٹے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ میں جانتا ہوں' اب ہمارے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی بلکہ ممکن ہے' رات کی کارروائی پر اب تک تم پر جھاڑ بھی پڑ چکی ہو۔ ایک بات بتاؤ کیا تمہیں کارروائی سے پہلے یہ بات معلوم نہیں تھی؟"

بوتھ میں جلیس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وار بہت کاری تھا۔ اس نے لہجے کو مضبوط بنانے

کی کوشش کرتے ہوئے کہا "وقت آنے پر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے لئے ہر انسانی جان برابر کی اہمیت رکھتی ہے۔"

بابر استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ اس نے کرسی سے ٹیک لگا کر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا "دیکھیں گے۔ جانتے ہو' تمہاری رات کی حماقت کے بعد میں اپنا منصوبہ بدلنے کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔ سوچتا ہوں' تمام یرغمالیوں کو ٹھکانے لگا دوں اور اسکول کو اڑا دوں۔"

"تمہیں اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔"

"یہ تو ہے۔ لیکن.......... خیر چھوڑو۔ اب تم نے میری ہدایات پر عمل نہ کیا تو میں یہی کچھ کروں گا" بابر نے کہا۔ پھر اس نے کمال رشید کے فلسفے سے استفادہ کیا "تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہمیں موت کی کوئی پرواہ نہیں۔ ہوتی تو ہم یہ کام نہ کرتے۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر جلیس نے پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟"

"ایک تو یہ کہ تم رات جیسی کوئی اور حماقت سوچنا بھی نہیں۔ میرے پاس تین طلباء اور دو ٹیچر ہیں اور ایک لڑکے کی اہمیت سے تم خوب واقف ہو۔ سمجھ رہے ہونا.........." اسی وقت ریڈیو پر کھرکھراہٹ ابھری اور پھر شہناز نے پوچھا "بابر.......... کیا ہو رہا ہے؟" بابر نے انٹرکام کے ریسیور کو ہاتھ سے ڈھانپا اور نذیر کو ریڈیو کی طرف اشارہ کیا "اس سے کہو' ابھی چپ رہے۔ میں ذرا انٹرکام پر بات کر لوں پھر اس سے بات کروں گا" پھر وہ نذیر کے شہناز کو سمجھانے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے ریسیور سے ہاتھ ہٹایا۔ "اب غور سے سنو ٹلے۔ میں چاہتا ہوں کہ پارکنگ ایریا میں ایک وین پہنچا دی جائے۔ چابیاں اگنیشن میں موجود ہوں اور ٹنکی فل ہونی چاہئے۔ میں سولہ سیٹ والی ویگن کی بات کر رہا ہوں۔ جس میں دونوں طرف چار چار شیشے ہوں اور اس ویگن میں سوٹ کیس میں بھرے پانچ کروڑ روپے بھی موجود ہوں۔ اس ویگن میں ہم چکلالہ ایئرپورٹ تک جائیں گے۔ وہاں تمہیں ہمارے لئے ایک بوئنگ ۷۳۷ کا بندوبست کر کے رکھنا ہوگا۔ یہ سب کچھ لکھ رہے ہو نا؟ جہاز کے اندر تین افراد پر مشتمل عملے کے سوا کوئی نہ ہو۔ کوئی چالاکی نہ کرنا اس لئے کہ ہم جہاز کو پوری طرح چیک کریں گے۔ ہمارے

ساتھ دھماکا خیز مادہ بھی ہوگا۔ کوئی بھی گڑبڑ ہوئی تو میں عملے سمیت جہاز کو اڑا دوں گا۔ سمجھ گئے؟"

"ہاں۔"

"بس تو لکھتے رہو۔ میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ جہاز میں چھ پیراشوٹ بھی موجود ہونے چاہئیں۔"

"یہ تو یک طرفہ معاملہ لگتا ہے۔ یہ بتاؤ' یہ سب کچھ کر کے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟"

"تمہیں صحیح سلامت جہاز' عملہ اور یرغمالی ملیں گے۔"

"دیکھو.......... تمہیں یہ سب کچھ مل جائے گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم یرغمالیوں کو یہیں چھوڑ کر جاؤ۔ میرا وعدہ ہے کہ ہم تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

"مسخرا پن مت کرو۔ تم مطالبات کی پوزیشن میں نہیں ہو ایس پی۔ ٹھیک چھ بجے تک یہ تمام کام ہو جانے چاہئیں۔ اب بہتر یہ ہے کہ تم مصروف ہو جاؤ" بابر نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا پھر وہ نذیر کی طرف مڑا "کم بخت' چالاکی سے باز نہیں آتا لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ اس کا واسطہ کس سے پڑا ہے۔"

☆============☆============☆

ایس پی جلیس نے ریسیور رکھا اور سامنے رکھے پیڈ کو گھورنے لگا' جس پر اس نے شرائط لکھی تھیں لیکن وہ ایک اور بات سوچ رہا تھا۔ بیک گراؤنڈ میں جو اس نے نسوانی آواز سنی تھی.......... جو بابر کو پکار رہی تھی' اس میں کوئی عجیب سی بات تھی لیکن کیا؟ نسوانی آواز سننا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ دہشت گردوں میں ایک عورت بھی شامل ہے۔ کاش۔ اس نے آواز ٹیپ کرنے کا کوئی بندوبست کر رکھا ہوتا۔ تب وہ یہ گفتگو دوبارہ سن سکتا تھا۔

لڑکی نے کیا کہا تھا.......... بابر' کیا ہو رہا ہے؟ ہاں یہی کہا تھا اس نے اور آواز اسی کمرے سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ تو پھر یہ پوچھنے کا کیا مطلب کہ کیا ہو رہا ہے؟ ممکن ہے' لڑکی سو گئی ہو اور کال کے درمیان اس کی آنکھ کھلی ہو لیکن نہیں.......... اس صورت میں تو وہ خود دیکھ سکتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے لیکن اور کوئی بات بھی تھی..........

جانی پہچانی سی مگر وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ چند لمحوں کی کوشش کے بعد اس نے اس خیال کو ذہن کے کسی دور کے گوشے میں دھکیل دیا۔ اس کے سامنے اور بھی مسئلے تھے۔

وزیر داخلہ مری آ چکے تھے لیکن انہوں نے بہت رازداری سے کام لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اخبار نویسوں کو فی الوقت اس صورت حال کا علم ہو۔ انہوں نے اس سے بہت اچھی طرح بات کی تھی' اس کی حوصلہ افزائی کی تھی اور اس پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے اس سے صورت حال پوچھی تھی۔ کارروائی کی تفصیل سنی تھی اور مزید کارروائی کے امکان پر اس سے تبادلہ خیال کیا تھا۔ وہ اس سے متفق تھے کہ اب مزید کارروائی یرغمالیوں کے لئے خطرناک ہو گی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ تاوان کی رقم شام تک پہنچ جائے گی اور انہوں نے خصوصی انسداد دہشت گردی اسکواڈ کا دستہ طلب کر لیا ہے لیکن جب تک مجرم اسکول میں ہیں' کیس کا انچارج وہی ہو گا۔ اس کے بعد اسکواڈ کا سربراہ کیس کا انچارج ہو گا۔ دونوں گروپ ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ انہوں نے اسے فون نمبر بھی دیا' جس پر وہ ان سے رابطہ کر سکتا تھا۔

جلیس نے پہلا کام یہ کیا کہ وزیر داخلہ کو فون کر کے انہیں مجرموں کی شرائط سے آگاہ کیا "تو وہ یرغمالیوں کو یہاں رہا کرنے پر آمادہ نہیں؟" وزیر صاحب کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"جی جناب۔"

"پیرا شوٹ طلب کرنے کا مطلب ہے کہ وہ درمیان میں کہیں جہاز سے کودیں گے۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ یہ فرمائش ہمیں دھوکا دینے کے لئے ہو" جلیس نے کہا۔

"ممکن ہے لیکن چھ پیرا شوٹ کیوں۔ تمہارا کہنا ہے کہ دہشت گرد صرف چار ہیں۔ کہیں وہ بدعہدی تو نہیں کرنا چاہتے!" وزیر کی آواز کسی اندیشے کے بوجھ سے لرزنے لگی۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا جناب۔"

"خیر...... دیکھو' میری یہ بات گرہ میں باندھ لو۔ تمہیں ان کی ہر ہدایت کی

تعمیل کرنی ہے۔ اب ضرورت پڑنے پر تم ہوم منسٹری سے رابطہ کرو گے' سمجھ گئے؟"

"جی ہاں جناب۔"

"گڈ لک۔"

رابطہ منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد اسپتال سے فون آیا۔ دو زخمی جوانوں میں سے ایک چل بسا تھا دوسرے کی حالت بدستور تشویش ناک تھی۔ جلیس کا وجود غصے سے پھنکنے لگا۔ کاش...... اسے موقع ملے۔ بابر اب اس کا ذاتی شکار بن گیا تھا۔ اس کے تین جوان زندگی سے محروم ہو چکے تھے۔

اگلے ایک گھنٹے وہ مواصلاتی ٹرک میں رابطوں میں مصروف رہا۔ یہ ٹرک دو گھنٹے پہلے آیا تھا اور میدان میں کھڑا تھا۔ اب اس کے لئے رابطہ کرنا زیادہ آسان ہو گیا تھا۔ اس نے ویگن کا بندوبست کیا اور راولپنڈی پولیس کو الرٹ رہنے کی ہدایت کی۔ فی الحال تو کیس اس کے ہی ہاتھ میں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ آہستہ آہستہ معاملہ اس کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ انسداد دہشت گردی اسکواڈ کا انچارج میجر نصیر تھا۔ وہ اس سے خندہ پیشانی سے ملا لیکن انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ مسئلہ وہی پیشہ ورانہ رقابت کا تھا۔

جلیس ٹرک سے نکلا تو خاصا بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اب اس کی ذمے داری میں اور لوگ بھی شریک ہو گئے تھے تو وہ خود کو نسبتاً ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا لیکن ساتھ ہی اس معاملے کو خود ہی کامیابی سے نمٹانے کی خواہش بھی زور پکڑ گئی تھی۔ اس کے پاس نفری کی کمی نہیں تھی۔ تو کیا وہ چار افراد کو...... صرف چار افراد کو ایک بھیانک جرم کامیابی سے کرنے سے نہیں روک سکتا تھا؟

وہ اپنے بوتھ کی طرف چل دیا۔ اس عزم کے ساتھ کہ مجرموں کو روکنے کی ایک کوشش اور کرنی ہے۔

وہ لسٹ ہاتھ میں لئے کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ میز پر رکھا واکی ٹاکی بڑبڑایا "سر...... پرنسپل جمیل الرحمٰن صاحب آپ سے ملنا آنا چاہتے ہیں۔"

اس نے ایک بٹن دبایا اور کہا "بھیج دو انہیں۔"

جمیل الرحمٰن جس وقت بوتھ میں داخل ہوا' جلیس بیٹھا واکی ٹاکی کو گھور رہا تھا۔

اس نے جمیل الرحمٰن کو آتے اور دو پیالیوں میں کافی انڈیلتے بھی نہیں دیکھا۔ جمیل الرحمٰن نے کافی کی پیالی اس کی طرف بڑھائی تو وہ چونکا۔

"کیا بات ہے۔ کسی گہری سوچ میں گم ہو؟" جمیل الرحمٰن نے پوچھا۔

"ایک بات مجھے مسلسل پریشان کر رہی ہے۔ میں اسے ذہن سے جھٹک نہیں پا رہا ہوں۔"

"کوئی اہم بات ہے؟"

"میں انٹرکام پر مجرموں کے سرغنے سے بات کر رہا تھا کہ پس منظر میں مجھے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ میں اس کی نوعیت نہیں سمجھ پا رہا ہوں" جلیس نے پُرخیال انداز میں کہا پھر چونک کر پوچھا "ایک بات بتائیں۔ فیکلٹی روم میں فون کی سہولت موجود ہے؟"

"نہیں۔ صرف انٹرکام ہے وہاں۔"

"مجھے یقین ہے کہ میں نے پس منظر میں گھٹی گھٹی سی......... کھرکھراتی ہوائی نسوانی آواز سنی تھی۔ اب مجھے خیال آرہا ہے کہ اس کے فوراً بعد بابر نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود جو کچھ اس نے کہا' میں نے سن لیا تھا۔ اس نے لڑکی کو خود خاموش رہنے کو نہیں کہا تھا۔ اس نے نذیر کو کہا تھا کہ اسے چپ کراؤ۔ میں بعد میں بات کروں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بولنے والی کمرے میں موجود نہیں تھی۔ بات سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ آواز سے لگتا تھا کہ بولنے والی اسی کمرے میں موجود ہے۔"

"ممکن ہے' وہ ایک دوسرے سے واکی ٹاکی کے ذریعے رابطہ کر رہے ہوں" جمیل الرحمٰن نے رائے زنی کی۔

"میں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن بچ نکلنے والے طلباء میں سے کسی نے بھی دہشت گردوں کے پاس ریڈیو نہیں دیکھا۔ جبکہ وہ چاروں اکٹھے بھی کلاس روم میں موجود رہے۔"

پرنسپل نے پیکٹ میں سے دو سگریٹیں نکالیں اور ایک جلیس کی طرف بڑھائی "یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان کا کوئی ساتھی باہر موجود ہو......... کسی ایسی جگہ' جہاں سے اسکول

نظر رکھی جاسکتی ہو۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا" جلیس نے کہا "میں یہ بات نہیں سمجھ سکا کہ آخر انہوں ے ہمہ وقت ایک آدمی کلاس روم میں کیوں نہیں رکھا' جو یرغمالیوں پر نظر رکھتا۔ اس ورت میں انہیں ہماری کارروائی کا ابتدا ہی میں علم ہوجاتا" وہ اٹھ کھڑا ہوا "آپ پلیز یں موجود رہیں۔ میں اب اپنے اس آدمی سے بات کروں گا' جس نے علاقہ خالی کرایا ا۔ میں اس سے کہوں گا کہ ہر اس دروازے کو دوبارہ چیک کرے' جہاں سے جواب یں ملا تھا اور اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہاں کوئی موجود نہیں" وہ دروازے کی طرف بڑھ یا۔ اس وقت' اس کے ذہن میں ایک ہی خیال تھا......... کاش' اس کے بعد کچھ زیادہ ملت ہوتی......... زیادہ وقت ہوتا!

☆-------------☆-------------☆

نذیر کے لئے وقت گھسٹ گھسٹ کر گزر رہا تھا۔ اس نے سونے کی کوشش کی ن وہ نیند اور بیداری کے درمیان معلق ہونے کی بدترین کیفیت سے دوچار رہا۔ اس کا م نیند کے لئے فریادیں کر رہا تھا لیکن اس کے ذہن کو ہر آواز' ہر آہٹ سے جھٹکا لگ رہا ا۔ مشکور اور شہلا کھانا کھانے کے لئے آئے تو انہوں نے حتی الامکان آہستگی سے کام ا۔ تاکہ اس کی نیند میں خلل نہ پڑے مگر صوفیہ بے آرام نیند میں ہذیانی انداز میں بڑائے جارہی تھی۔ پانچ بجے کے قریب نذیر تنگ آکر اٹھ بیٹھا۔ بابر نے روانگی کی اریاں شروع کردی تھیں۔ وہ ہچکچاتے ہوئے اس کی مدد کرنے کے لئے اٹھا۔

فیکلٹی روم میں زندگی اور امید کی لہر دوڑ گئی تھی۔ شاید اسیر اور صیاد دونوں ہی س تھے کہ جمود ٹوٹ گیا ہے اور اب وہ کچھ مختلف کام کر رہے ہیں۔ اسکول کی عمارت ب انہیں کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔ گزشتہ رات کے حملے اور اس کے بعد کی کشیدگی نے ب کو نڈھال کردیا تھا۔ بابر کے سوا کوئی ایسا نہیں تھا' جو دوبارہ اس صورت حال کا سامنا رنے کے لئے تیار ہو اور اس کی ہمت رکھتا ہو۔ وہ سب چاہتے تھے کہ اب جلد از جلد معاملہ ختم ہو اور انہیں سکون اور تحفظ کا احساس میسر آئے۔

نذیر اس امید پر بے یقینی کا کوئی سایہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بابر سے یرغمالیوں کے

مستقبل کے متعلق بات کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ ایک وقت ایسا تھا' جب وہ یہ کہہ سکتا کہ وہ محفوظ رہیں گے۔ بابر منصوبے کی کامیابی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ لہٰذا خون خرابے کا کوئی امکان نہیں تھا' اس پر مستقبل کے منصوبوں کی کامیابی کا انحصار تھا۔ انہیں یہ تاثر چھوڑنا تھا کہ زرتاوان کی ادائیگی یرغمالیوں کے تحفظ کی ضمانت ہوتی ہے۔ ورنہ آئندہ کون سوچے گا کہ یرغمالیوں کی لاشوں کے لئے بھاری زرتاوان ادا کیا جائے۔ یوں تو مستقبل میں صرف کمانڈو کارروائیاں ہونا تھیں مگر اب وہ جانتا تھا کہ بابر کا رویہ بدل گیا ہے۔ اس نے منطق کو شاید اپنے نئے نکتہ نظر کے حق میں الٹ دیا تھا۔ اب وہ یرغمالیوں کو ختم کرنے کے لئے یہ دلیل دے گا............ اس طرح پولیس کو معلوم ہوجائے گا کہ ان کی حماقت کے جواب میں ہم کیا کرسکتے ہیں' وہ یرغمالیوں کی موت کی ذمے داری پولیس پر ڈال دے گا۔ وہ کہے گا............ اگر پولیس نے کارروائی نہ کی ہوتی تو یرغمالیوں کا بال بھی بیکا نہ ہوتا' اس نے مجبوراً پولیس کو اپنی ہٹ دھرمی اور بے عقلی کی سزا دی ہے۔ بابر میں یہ عجیب وصف تھا کہ وہ اپنے ہر نکتہ نظر کو درست ثابت کر دیتا تھا اور نذیر جانتا تھا کہ یرغمالیوں کو ختم کرنے کی بابر کی خواہش بے حد توانا ہے۔

اسے شہناز کی آواز نے چونکا دیا۔ اس نے ریڈیو اٹھایا "کیا بات ہے؟" شہناز نے کہا "وجہ مجھے نہیں معلوم لیکن اپارٹمنٹ بلڈنگ کو دوبارہ چیک کیا جا رہا ہے" اس کے لہجے میں پریشانی تھی "باہر خاصی تعداد میں پولیس والے نظر آ رہے ہیں۔"

"تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ پولیس اسکول کے پارکنگ ایریا کو نہیں گھیر رہی ہے............ اور ہمیں روکا نہیں جائے گا؟" نذیر کو اپنی فکر پڑی تھی۔

بابر کمرے میں چلا آیا اور ان کی گفتگو سننے لگا۔

"ممکن ہے' گھیر رہے ہوں مگر میں کیا کروں' میں نروس ہو رہی ہوں۔"

"وہ دوبارہ دستک دیں' تب بھی دروازہ نہ کھولنا۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا" نذیر نے اسے تسلی دی "اب اسکول کی صورت حال بتاؤ۔"

"میدان میں ایک ٹویوٹا ہائی ایس ویگن کھڑی کر دی گئی ہے۔"

"رقم کا سوٹ کیس بھی دکھائی دیا؟"

"ابھی تک تو نہیں دیکھا۔ اتنی گاڑیاں آ جا رہی ہیں کہ سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"رقم آجائے تو ہم بیس منٹ کے اندر اندر نکل لیں گے۔" نذیر نے آہ بھر کے کہا۔

"نذیر............ میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاسکتی کیا؟ پلیز............ مجھے بھی لے چلو تم لوگ۔"

"نہیں" بابر نے مداخلت کی "اس سے کہو کہ یہ بعد میں مقررہ مقام پر پہنچے گی۔ اکیلی۔ منصوبے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔"

نذیر نے وہ پیغام ریڈیو پر دہرا دیا۔

"مجھے پولیس والوں کی موجودگی سے ڈر لگ رہا ہے۔ نذیر............ پلیز............ مجھے ساتھ ہی لے چلو۔"

"فکر نہ کرو۔ جلد ہی ہم ملیں گے شہناز۔"

"اچھا............ اپنی طرف کی کوئی خاص خبر تو سناؤ۔"

نذیر نے کن انکھیوں سے بابر کو دیکھا' جو دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا "رات بابر نے ایک طالبہ کے ساتھ زیادتی کی۔ نازیہ نام ہے اس کا............ نازیہ توقیر۔"

ریڈیو پر چند لمحے خاموشی رہی "نازیہ توقیر" پھر شہناز نے عجیب سے لہجے میں دہرایا۔

"کیوں؟ تم جانتی ہو اسے؟"

"نہیں............ نہیں تو۔ بس توقیر نام کا ایک شخص یاد آگیا تھا............ کاش............ کاش............" ساتھ ہی ریڈیو آف ہوگیا۔

بابر کمرے میں واپس آیا اور عجیب سی نظروں سے انٹرکام کو دیکھتا رہا۔ نذیر نے جان لیا کہ اس وقت اس ذہن میں کوئی خوش گوار سوچ نہیں ہوسکتی۔ اچانک بابر تیزی سے ایڑیوں کے بل گھوما اور تند لہجے میں بولا "اگر انہوں نے کوئی حماقت کی تو اس بار عمر بھر پچھتائیں گے اور تم............ تم اس بار مجھے روکنے کی غلطی نہ کرنا۔"

☆----------☆----------☆

شہناز نے ریڈیو آف کیا اور کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے تصور میں فلم سی چلنے لگی۔ اپنی بربادی کی فلم! توقیر کا نام سن کر اسے ویڈیو والا توقیر یاد آ گیا تھا۔ توقیر جس نے صرف اسے ہی نہیں' جانے اس جیسی کتنی معصوم لڑکیوں کو تباہ کیا ہو گا۔ اس کے گھرانے جیسے کتنے ہی گھرانوں کو برباد کیا ہو گا۔ کاش یہ نازیہ اسی توقیر کی بیٹی ہو۔ عمل مکافات اسی کو تو کہتے ہیں لیکن نہیں' یہ کیسے ممکن ہے.......... کہاں ممکن ہے۔ خدا بھی ایسوں کو ڈھیل دیتا ہے۔ ان کی رسی کہاں کھینچی جاتی ہے اور پھر کہاں کراچی اور کہاں مری کا یہ اسکول!......... پھر بھی......... کاش......... کاش.........

اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جس زخم کے متعلق وہ سمجھ رہی تھی کہ مندمل ہو چکا ہے' اب بھی ہرا تھا۔ ایک یاد کی ٹھیس لگی تھی تو ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

وہ روتی رہی۔ کیا میرے قاتل کا احتساب کرنے والا کوئی نہیں......... کوئی بھی نہیں؟ نہ آسمان پر! کیا میری تباہی کا حساب کوئی نہیں لے گا؟ خدا بھی نہیں!

☆----------☆----------☆

جلیس نے اپنی گھڑی پر اور پھر انٹر کام پر نظر ڈالی۔ سب کچھ سیٹ تھا۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ نیچے ویگن تیار کھڑی تھی۔ چار سوٹ کیسوں میں پانچ کروڑ روپے کی رقم بھی پہنچ چکی تھی۔ رقم پولیس کی ایک گاڑی میں رکھی تھی۔ جلیس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اردگرد کی عمارتوں سے کوئی دیکھ بھی رہا ہو تو اسے رقم کے سوٹ کیسوں کی جھلک بھی دکھائی نہ دے اور اب اس کے سامنے ایک مشکل فیصلہ تھا۔ ایک طرف تو وہ بابر کو مشتعل کرنے سے خوف زدہ تھا۔ دوسری طرف وہ اسے کامیاب بھی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اسے مہلت درکار تھی۔ اسکول کے قریب کی عمارتوں کی تلاشی کا ابھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ نتیجہ نکلے گا ضرور۔ اگر مجرموں کی باہر والی ساتھی پکڑی گئی تو اس سے کام کی معلومات حاصل کی جا سکیں گی۔ ویسے بھی اس قسم کی صورت حال میں دنیا بھر میں ایک ہی حکمت عملی آزمائی جاتی ہے۔ دہشت گردوں کو لٹکائے رکھنا اور انہیں تھکانا۔ جب وہ تھک جاتے ہیں تو ان کا ارتکاز اور

ان کی قوت فیصلہ متاثر ہوتی ہے۔ ان کا دفاع کمزور ہو جاتا ہے۔ ایسے میں انہیں ہتھیار ڈالنے پر بھی مجبور کیا جا سکتا ہے اور دوسری صورت میں ان پر کاری وار کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔

لیکن ایک مسئلہ تھا۔ اوپر کے احکامات تھے کہ مجرموں کا ہر مطالبہ تسلیم کر لیا جائے۔ اس میں جلیس کو توہین محسوس ہو رہی تھی۔ گویا اوپر والے اس کی اہلیت پر یقین نہیں رکھتے۔ سب سے بڑا مسئلہ یرغمالیوں میں وزیر داخلہ کے بیٹے کی موجودگی کا تھا۔ اب اگر جلیس اپنے طور پر مجرموں کو روکنے کے لئے کوئی قدم اٹھاتا تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہوتا اور لٹکائے جانے کی صورت میں بابر کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اب تک جلیس اس کی فطرت کو بڑی حد تک سمجھ سکتا تھا۔

پھر اس نے سوچا' اس کا کیریئر تو ویسے ہی داؤ پر لگ چکا ہے۔ وزیر داخلہ نے اسے سراہا تھا لیکن سیاست دانوں کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس پر کئی الزام لگنے تھے آخر میں۔ اسے کارروائی کے سلسلے میں جواب دہی کرنی تھی۔ پھر اس کے بیٹے کی یرغمالیوں میں موجودگی بھی زیر غور آتی۔ ہر صورت میں پھندے کے لئے مناسب ترین گردن اسی کی ہوتی۔ لہٰذا اب ڈرنا کیا؟

وہ بابر کی بے رحمی سے خوف زدہ تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک آخری کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ محض چند گھٹیا مجرموں کے سامنے اس کا محکمہ ذلیل ہو۔

اسی وقت واکی ٹاکی گنگنایا۔ اس نے بٹن دبایا "سر......... توقیر نامی ایک صاحب آئے ہیں۔ ان کی بیٹی نازیہ یرغمالیوں میں شامل ہے۔"

جلیس سمجھ گیا۔ اس لڑکی کا باپ' جس کے ساتھ بابر نے زیادتی کی تھی "ان سے کہو۔ میں ابھی نیچے آتا ہوں۔"

واکی ٹاکی بند کر کے وہ انٹر کام کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور فیکلٹی روم کا نمبر دبایا۔

بابر نے فوراً ہی جواب دیا' لگتا تھا وہ انٹر کام کے پاس ہی منتظر بیٹھا تھا۔

☆----------☆----------☆

بابر کے چہرے کے تاثر سے نذیر نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی اچھی خبر کی توقع نہیں کررہا ہے۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا "یس؟"

دوسری طرف سے ایس ایس پی جلیس نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ رقم آنے میں تاخیر ہورہی ہے۔"

"پانچ منٹ کے اندر اندر ویگن رقم سمیت نیچے پہنچ جانی چاہئے۔"

"دیکھو.......... ہم ناممکن کو تو ممکن نہیں بناسکتے۔ تم جانتے ہو کہ آج جمعہ ہے۔"

"میرے منصوبے کے عین مطابق" بابر نے سرد لہجے میں کہا "یہ جس لیول کا معاملہ ہے۔ اس میں بینکوں کی چھٹی کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"اس کے باوجود.........."

بابر نے اس کی بات کاٹ دی "صرف اور صرف پانچ منٹ ہیں تمہارے پاس۔"

"سنو.......... کم از کم دو گھنٹے ضرور لگیں گے۔"

"تم بہت احمق آدمی ہو کُٹلے.......... بہت ہی بے وقوف" بابر پھنکارا "میں تمہیں ہر طرح کی وارننگ دے چکا ہوں۔ اب تمہیں پتا چل جائے گا" اس نے ریسیور پٹخا اور اٹھ کر کمرے کے وسط میں گیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ وہ کمال کو گھورتا رہا۔ اس کے اندر اس شخص کے لئے نفرت اُمڈ رہی تھی۔ وہ اس کی طرف ایک قدم بڑھا مگر رک گیا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں دھند سی اتری لیکن فوراً ہی چھٹ گئی۔ اب اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ اس نے رخ بدلا اور نازیہ کی طرف بڑھنے لگا۔ رئیس اور مظفر سہم کر ایک طرف ہٹ گئے۔ نازیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ہذیانی انداز میں چلانے لگی۔ بابر نے اس کا ہاتھ تھاما اور جھٹکے سے اسے صوفے سے کھینچا۔ وہ اسے فرش پر گھسیٹتے ہوئے دروازے کی طرف لے چلا۔ نازیہ نے مزاحمت کی کوشش کی۔ پہلے اس نے ایک کرسی پکڑی.......... پھر دروازے کا فریم لیکن بابر کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔ وہ اسے راہداری میں گھسیٹ لے گیا۔

کمال بڑی جدوجہد کرکے کرسی سے اٹھا اور اس نے پاس سے گزرتی ہوئی نازیہ کی ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی لیکن رائفل کی نال نے اسے دوسری طرف الٹ دیا۔ پھر بھی

اٹھ کر دروازے کی طرف دو قدم بڑھا۔ اس بار رائفل کی نال اس کے پیٹ میں لگی۔ نال کو دور ہٹاتے ہوئے پھر بھی بڑھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن نذیر رائفل آگے بڑھائے اپنی جگہ مضبوطی سے کھڑا رہا۔ وہ نفی میں سر ہلائے جارہا تھا "تم اسے روک نہیں سکتے ہٹو۔ تم صرف مرسکتے ہو" اس کے لہجے میں دھمکی نہیں' التجا تھی اور نذیر سچ کہہ رہا تھا۔ جو کچھ ہونے والا تھا' اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ بابر کو کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔

لیکن کمال اسے دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بار بار سر جھٹک رہا تھا۔ اس کے اندر اس حقیقت کی قبولیت موجود تھی کہ کچھ نہیں کیا جاسکتا مگر وہ اس سے لڑ رہا تھا۔ وہ حقیقت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے رائفل کی نال پر جھپٹا مارا لیکن رائفل تیزی سے پیچھے ہٹالی گئی۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھا۔ اسی لمحے رائفل کا دستہ اس کے زخمی کندھے سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ درد اس کے پورے جسم میں دوڑ گیا۔ متلی کا احساس جاگ اٹھا پھر بھی اس نے رینگ کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن آدھے راستے میں ہی بے ہوشی کے اندھیرے نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

نازیہ کی چیخیں پوری بلڈنگ میں گونج رہی تھیں.......... در و دیوار سے پھوٹتی محسوس ہورہی تھیں.......... کلاس روم میں پہنچنے کے بعد بابر نے نازیہ کو چھوڑ دیا' جو مسلسل پنجے اور لاتیں چلانے کی کوشش کررہی تھی۔ اس نے نازیہ کے ٹھوکر ماری۔ یوں اس کی ٹانگ نازیہ کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ بابر نے جھک کر لڑکی کو بالوں سے پکڑا.......... اور اسے گھسیٹتے ہوئے اندر لے گیا اس وقت اسے لڑکی سے شدید نفرت محسوس ہورہی تھی۔ وہ اس کے لئے اس پلیٹ کی طرح تھی' جس میں ایک بار کھانا کھا کر اسے پھینک دیا جاتا ہے۔ اس نے اس کے بالوں کو اپنی کلائی پر لپیٹا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے سر پر پوری قوت سے گھونسا مارا پھر اس نے شاٹ گن فرش پر پھینکی اور اپنے آزاد ہاتھ سے کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ باہر اس نے اسٹیڈیم کے اسکورنگ بوتھ کی طرف دیکھا۔ فاصلہ زیادہ تھا پھر بھی اسے ایک ہیولا سا شیشے کے بوتھ میں کھڑا نظر آرہا تھا۔ وہ اسی کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بابر نے بڑی تیزی سے لڑکی کو بالوں سے تھام کر کھڑا کیا اور اپنی بیلٹ سے ریوالور نکالا۔ ایک ہی وار میں کھڑکی کا بچا کھچا شیشہ بھی ٹوٹ گیا۔ اس وقت اس کے دل میں رحم کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اس نے ریوالور نازیہ کی کنپٹی سے لگایا اور ٹریگر دبادیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے لڑکی کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

☆-----------☆-----------☆

ایس پی جلیس نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ اسے سلوموشن میں ٹی وی پر چلنے والا کوئی غیر حقیقی منظر لگا تھا۔

کھڑکی سے پردے ہٹے۔ لڑکی کا معصوم چہرہ نظر آیا پھر لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر اٹھانے والا ہاتھ نگاہوں سے اوجھل ہوا......... صرف ایک ثانیے کے لئے پھر اس ہاتھ نے کھڑکی کا شیشہ توڑا۔ لڑکی کے ہاتھ بے نام مزاحمت کے لئے اوپر اٹھے پھر براؤن بالوں کے ہالے میں وہ چاند سا حسین چہرہ......... وہ خوب صورت سر' اور پھر جیسے کیمرہ ٹرک کے ذریعے وہ سر اور چہرہ چھنا بکھرتا نظر آیا۔ سلوموشن میں۔ اسے فائر کی آواز نہیں سنائی دی۔ اس کا دماغ جیسے سن ہو گیا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے سر کی اس گڑیا کو دھیرے دھیرے نیچے گرتے دیکھا۔ اب وہ چھوٹی سی گٹھری زمین پر کھلی پڑی تھی۔ وہ آگے کی طرف جھکا۔ اس نے ہاتھ پھیلائے' جیسے بچی کو زمین سے اٹھا کر اپنی حفاظت میں لینا چاہتا ہو مگر اس کے ہاتھ شیشے کی دیوار سے ٹکرا کر رہ گئے۔ وہ مڑی تڑی' ٹوٹی پھوٹی گڑیا زمین پر بکھری پڑی تھی۔ وہ زندگی سے محروم ہو گئی تھی......... صرف اس لئے کہ اس نے ایک احمقانہ فیصلہ کرنے کی غلطی کی تھی۔

اسے احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی انگلیاں شیشے کی دیوار میں گھسنے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اس نے واکی ٹاکی کی بڑبڑاہٹ بھی نہیں سنی۔ اس کی توجہ صرف زمین پر پڑے اس بے جان وجود پر مرکوز تھی لیکن قدرت نے اسے اس کے گھر میں نہیں اتارا تھا۔ بلکہ اس کے لئے دنیا کی ہر بچی......... ہر لڑکی کو اس کی بیٹی بنادیا تھا اور اب اس کی وہ بیٹی مر گئی تھی......... اس سے ہمیشہ کے لئے چھن گئی تھی صرف اس لئے کہ اس نے اپنی انا کے زیر اثر غلط فیصلہ کر کے اسے بھینٹ چڑھا

دیا تھا۔ شاید اس لئے خدا نے اسے بیٹی نہیں دی تھی۔ وہ بیٹی کا باپ بننے کا اہل ہی نہیں تھا۔ بیٹی کے باپ کہیں ایسے ہوتے ہیں!

وہ پہلا موقع تھا کہ اسے اپنے سینے میں دل کے مقام پر کند دھار کے ایک نامانوس درد کا چاقو اترتا محسوس ہوا۔ اس درد نے ہی اسے اس جہنم سے رہائی دلائی' جس میں وہ جل رہا تھا۔ اس درد نے ہی اسے گردوپیش کا احساس دلایا۔ بوتھ میں کوئی موجود تھا۔ وہ اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے بازو کو تھام کر جھنجھوڑ رہا تھا اسے۔ وہ ایک ہی بات بار بار دہرائے جارہا تھا۔ بالآخر اس کی سماعت کا بند دروازہ کھل گیا۔

”کیا ہوا سر؟ آپ ٹھیک تو ہیں۔“

وہ جھٹکے سے شیشے کی دیوار سے پیچھے ہٹا۔ اس نے سر گھما کر اپنے انسپکٹر کو دیکھا اور یوں بولا جیسے میلوں دور سے بول رہا ہو ”ان خبیثوں کو ویگن دے دو۔ انہیں اس لعنتی رقم کے وہ سوٹ کیس بھی دے دو اور عمارت کے پاس سے ہر جوان کو ہٹالو۔ انسداد دہشت گردی والوں کو بھی ہٹادو۔ انہیں جانے دو۔ روکنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔“

انسپکٹر چند لمحے اسے الجھن بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا ”بہت بہتر سر۔“

ایس پی جلیس کی نظریں انٹرکام پر جم گئیں۔ اس کے درد سے نڈھال دل میں وحشت کی ایک تند لہر اٹھی۔ اس نے سینے پر رکھا دل کو تھامنے والا ہاتھ اٹھایا اور انٹرکام کو تار سمیت اکھاڑ پھینکا۔ اس پر بھی وحشت میں کمی نہیں ہوئی تو اس نے پلاسٹک کے اس بکس کو اٹھا کر بوتھ کے دروازے سے باہر پھینک دیا۔

☆-----------☆-----------☆

شہناز اپنے آنسوؤں سے لڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنی چیخ کو روکنے کے لئے اس نے اپنی سختی سے بھینچی ہوئی مٹھی منہ میں ٹھونس لی تھی۔ ہاتھ میں جہاں اس کے دانت گڑے تھے' خون نکل آیا تھا۔ اس نے اس بے رحمانہ فعل سے منہ موڑنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بہت سرعت سے انجام دیا گیا تھا اور اب اس کی نظریں زمین پر پڑے ٹوٹے پھوٹے وجود پر جمی تھیں۔ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ لڑکی کو کس نے شوٹ کیا

ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ صرف بابر ہی اس سفاکی کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔

اب وہ سوچ رہی تھی۔ میں نے یہ کیا کیا؟ ایسے سفاک آدمی سے کیوں منسلک ہوئی میں! لیکن فوراً ہی اسے اپنے اندر سے جواب بھی مل گیا.......... اندھا جواب۔ اب اس گروپ کے سوا دنیا میں اس کا ہے ہی کون؟ وہ پہلے ہی ذلت کی انتہائی پستیوں میں گر چکی تھی۔ "لیکن اب تو تم اس سے بھی نیچے چلی گئی ہو" ضمیر نے پکارا "کیا تم خود کو اس معصوم لڑکی کا قاتل تسلیم نہیں کرو گی؟ کیا بابر نے تمہاری کمزوریوں کو ایکسپلائٹ نہیں کیا؟ کیا تم اس کی نظروں میں سرخرو ہونے کے لئے پہلے ہی ایک معصوم آدمی کو قتل نہیں کرچکی ہو؟ اب تم مظلوم نہیں، ظالم ہو۔" اس کے پاس اس ہٹ دھرمی کے سوا کوئی دفاع نہیں تھا کہ اب یہی لوگ اس کی فیملی ہیں۔

اسے پتا بھی نہ چلا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اس نے اسکول کی طرف دیکھا۔ اسکول کے افتادہ سرے والے داخلی دروازے پر ویگن کھڑی کردی گئی تھی۔ پولیس والے باہر جارہے تھے۔ سڑک پر سے رکاوٹیں ہٹائی جارہی تھیں۔ اسٹیڈیم بھی خالی ہوگیا تھا اور پارکنگ ایریا بھی۔ البتہ اسٹیڈیم کے اسکورنگ بوتھ میں ایک شخص موجود تھا۔ وہ بھی اب باہر نکل رہا تھا۔

شہناز نے دوربین کا رخ لڑکی کی لاش کی طرف کیا۔ اسے دھچکا لگا۔ اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ جو شخص لڑکی کی لاش کو سینے سے لگائے زمین پر گھٹنے ٹیکے بیٹھا تھا، اس کا چہرہ اس طرف تھا.......... اور وہ ہی توقیر تھا.......... اس کا اپنا قاتل.......... ویڈیو شاپ والا توقیر۔

شہناز کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ تو دنیا میں بھی انصاف ملتا ہے! انسانوں سے نہیں ملتا تو خدا سے تو ملتا ہے لیکن ایسا کیوں ہے کہ اس کے کلیجے میں ٹھنڈ نہیں پڑی۔ وہ خوش کیوں نہیں ہے۔ وہ اب بھی دکھی ہے.......... اس درندہ نما انسان کی بیٹی کے لئے، جو بہرحال معصوم اور بے گناہ تھی۔

پھر ایک پولیس والا آیا اور توقیر کو سہارا دے کر اپنے ساتھ اسکول سے باہر لے

یا۔ دوسری طرف اسٹیڈیم کے اسکورنگ بوتھ میں موجود شخص مضطربانہ انداز میں ٹہل رہا تھا۔

اسکول کی عمارت کا داخلی دروازہ تھوڑا سا کھلا اور شہلا اور نذیر نے محتاط انداز میں ر نکال کر جھانکا۔ وہ لوگ اس کی طرف سے مثبت اطلاع کے باوجود کوئی خطرہ مول نہیں لے رہے تھے پھر دروازہ پوری طرح کھلا اور نذیر نے بھاگتے ہوئے دروازے سے ویگن ک کا فاصلہ طے کیا اور ویگن کے پیچھے دبک کر گردوپیش کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے رائیور سائیڈ کا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ویگن میں داخل ہونے کے بعد اس نے سینے کے بل رینگتے ہوئے ویگن کی پوری طرح تلاشی لی۔ اس نے سیٹوں کے نیچے ھانکا، فلور میٹس کو ہٹا کر دیکھا اور ڈیش بورڈ کی تلاشی لی۔ مطمئن ہونے کے بعد وہ رائیونگ سیٹ پر واپس چلا آیا۔ اس نے ویگن اسٹارٹ کی اور اس کا رخ تبدیل کردیا۔ ب ویگن کا رخ اسکول کے سامنے والے گیٹ کی طرف تھا اور وہ داخلی دروازے سے زیادہ ملی کھڑی تھی۔

چند لمحے بعد اسکول کے داخلی دروازے سے چار یرغمالی نکلے۔ ان کے پیچھے شہلا ر مشکور تھے۔ ان کے ہاتھوں میں موجود ریوالوروں کا رخ یرغمالیوں کی طرف تھا۔ غمالی ویگن میں بیٹھ گئے۔ ان کے پیچھے شہلا اور مشکور تھے۔

آخر میں بابر باہر آیا۔ وہ سیدھا ویگن میں نہیں گیا۔ بلکہ ٹہلتا ہوا کارنر کی طرف ھا۔ اس نے اسٹیڈیم کی طرف دیکھا پھر جو کچھ ہوا، وہ شہناز کے لئے قطعاً خلاف توقع ا۔ بابر نے رائفل بلند کی اور بہت تیزی سے سکورنگ بوتھ کی طرف کئی فائر کئے پھر وہ تی سے ویگن کی طرف آیا اور نذیر کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ویگن گیٹ کی طرف چل دی۔

☆----------------☆----------------☆

بوتھ میں موجود جلیس نے پہلے دہشت گرد کو باہر آکر ویگن میں بیٹھتے دیکھا۔ اس ' سینے میں درد ابھی نہیں تھما تھا لیکن بے بسی اور غصے نے درد کے احساس کو دبا دیا تھا۔ منحوس بابر کو دیکھنا چاہتا تھا اور جب بابر سامنے آیا تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ دبلا پتلا، پستہ

قامت اور بدشکل آدمی تھا۔ جس پر عام حالات میں کوئی دوسری نظر ڈالنا پسند نہ کرے۔
جلیس اتنا حیرت زدہ تھا کہ کھلا منہ لئے اسے تکنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

منحنی دہشت گرد کارنر تک آیا اور بدمعاشی کے انداز میں دونوں ٹانگیں کھول کر کھڑا ہوگیا پھر اس نے رائفل بلند کی۔ رائفل کا رخ جلیس کی طرف تھا۔

جلیس لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اسی لمحے پہلی گولی بوتھ کی شیشے کی دیوار توڑ کر اندر آئی۔ وہ کرچیوں کی بوچھار کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے وہ بوکھلایا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ پیچھے رکھی میز سے ٹکرایا تو فیصلہ خود بخود ہوگیا۔ وہ لڑکھڑا کر فرش پر گرا' جہاں اب کرچیاں ہی کرچیاں تھیں۔ وہ فرش پر دم سادھے پڑا تھا۔ سینے کا درد شدت بھی پکڑ گیا تھا اور پھیلتا ہوا بائیں کندھے کے عضلات تک بھی آپہنچا تھا۔ اس کی سانس اتھلی اور تیز ہوگئی تھی۔ ہر سانس اس کے بائیں پہلو میں چاقو کی طرح گھستی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن اس کوشش نے اذیت کے ساتھ مل کر اسے مفلوج سا کر دیا۔ اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے اور درد کو کم کرنے کے لئے سانس لینے میں کمی کر دی۔ ذرا دیر بعد درد کم ہو گیا البتہ وہ اس کے کندھے کی نسوں کو اب بھی دھیرے دھیرے تھپک رہا تھا۔

اس نے اپنے پورے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ گولی کہاں پیوست ہوئی ہے۔ ... ٹٹولنے کے بعد وہ حیران رہ گیا۔ کوئی گولی اسے نہیں لگی تھی۔ وہ آہستگی سے فرش سے اٹھا اس کے ہاتھ میں شیشے کی کرچیاں چبھی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ بالکل زخمی نہیں تھا۔

اس نے جلدی سے واکی ٹاکی اٹھایا' جس پر کوئی اسے کم از کم ایک منٹ سے پکار رہا تھا۔ "میں خیریت سے ہوں" اس نے کہا "انہیں جانے دو" پھر اس نے باہر دیکھا۔ ویگن اب گیٹ سے نکل رہی تھی۔ وہ دیکھتا رہا۔ اس کے جسم میں خفیف سی لرزش تھی۔ وہ متضاد جذبوں کے طوفان کی لپیٹ میں تھا۔ جسمانی طور پر خوف اور غصہ اسے لرزا رہے تھے اور ذہنی طور پر وہ نڈھال بھی ہو رہا تھا اور اسے ہلکا پھلکا ہو جانے کا احساس بھی تھا۔ کاش........ اس وقت بابر اس کے قابو میں ہوتا مگر ساتھ ہی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ

وہ بری الذمہ ہو چکا ہے۔

☆==========☆==========☆

شہناز نے ویگن کو عمارت کے سامنے سڑک سے گزرتے اور پہاڑی سڑک پر ں سے اوجھل ہوتے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ لوگ جا رہے تھے۔ کا جی چاہا کہ اپارٹمنٹ سے نکلے۔ بھاگتی ہوئی سڑک پر پہنچے اور ویگن کو رکنے کا اشارہ .... کہے........ مجھے بھی لے چلو۔ مجھے اکیلا کیوں چھوڑ رہے ہو؟ بابر اس کی ِقت کی کیفیت کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بابر نے اسے استعمال کیا ہے پھر بھی اسے بابر کی ضرورت تھی' پورے گروپ کی ضرورت تھی۔ اب ان لوگوں وا دنیا میں اس کا تھا ہی کون۔ ان کے سوا کسی کے نزدیک اس کی کوئی وقعت نہیں ور اب........ اب تو وہ قاتلہ بھی تھی اور ملک کی تاریخ کے مکروہ ترین جرم میں بھی۔ یہ زیادتی تھی کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اسے ان کے ساتھ ہونا تھا۔ صرف ان کے درمیان ہونا ہی اسے تحفظ کا احساس دے سکتا تھا اور اب تو نذیر کے ساتھ مل کر گھر بنانا........ گھر بسانا تھا۔ معصوم اور بے گناہ لوگوں کے خون دبی ہوئی دولت کی مدد سے! اور اس گھر کا نام رکھنا تھا........ خونی محل! کچھ بھی مجھے تو شاید گھر ایسے ہی مل سکتا تھا۔

ابھی ان کو گئے ہوئے صرف چند منٹ ہوئے تھے اور وہ انہیں مس کر رہی تھی۔ کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جو کچھ تھا' وہ تو اب نہیں بدل سکتا تھا لیکن اب کامیابی کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ یہ ضروری تھا کہ بابر کو اس کے خواب کی تعبیر ملے۔ جو خون اب تک بہایا جا چکا تھا' اسے اب ستھری زندگی سے دھویا جا سکتا تھا۔ اب یہ خون کے رشتوں سے محروم فیملی اچھی گزارے۔ بس اب اس کی یہی آرزو تھی۔

لیکن اسکول میں........ سامنے پڑی معصوم لڑکی کی لاش کو دیکھ کر اسے کچھ ہو رہا ں پر وحشت طاری ہو رہی تھی۔ یہ جرم کبھی دھل سکتا ہے۔ خون کے دھبے کبھی ہو سکتے ہیں۔ سب بے کار ہے۔ اس زندگی کو تو اب صرف موت کے دامن میں پناہ

مل سکتی ہے۔ اس کے اندر دو بالکل متضاد جذبے بہت شدت اور تندی سے ابھر رہے تھے...... آپس میں لڑ رہے تھے۔ اسے لگتا تھا کہ وہ پاگل ہوجائے گی۔

اس نے دوربین کا رخ لاش کی طرف کردیا۔ ہوا کے ہلکے جھونکے مرنے والی کے براؤن بالوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کررہے تھے پھر اچانک ہر طرف سے پولیس والے اسکول میں آنے لگے۔ ان میں توقیر بھی تھا۔ اس نے پھر لاش کو اپنے سینے سے لگایا...... اور اب شاید وہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔

شہناز کا جی چاہا کہ وہ بھی چیخ چیخ کر رو دے۔

بوتھ میں موجود شخص میدان سے گزرتا ہوا اسکول کی طرف آرہا تھا۔ لاش اور سوگوار باپ کو نظرانداز کرکے وہ اسکول میں چلاگیا۔ ذرا دیر بعد وہ بدقسمت کلاس روم میں نظر آیا۔ وہ شیشوں سے محروم کھڑکی میں جھکا نیچے دیکھ رہا تھا۔ شہناز آگے کو جھکی۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی سوچیں پڑھنا چاہتی تھی۔

اب وہ کچھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ماضی پھر رہا تھا۔ کبھی اس کے پاس سب کچھ تھا...... ماں، باپ، بہن، بھائی، گھر اور اچھے مستقبل کی امید اور اب...... اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا اور وہ وہی سب کچھ حاصل کرنا چاہ رہی تھی مگر قانون اور اخلاق والے یہ بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔

وہ بری طرح چونکی۔ کھڑکی میں کھڑا شخص اب براہ راست اسے دیکھ رہا تھا...... اور نہ جانے کب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ گڑبڑا کر کرسی سے اٹھی اور لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے ہٹی۔

☆============☆============☆

میدان سے گزر کر اسکول کی طرف جاتے ہوئے جلیس کو یقین ہوگیا کہ اس کے سینے میں کوئی مسل کھنچ گئی ہے۔ حرکت کے ساتھ تکلیف بڑھ رہی تھی۔ تکلیف اتنی بھی نہیں تھی کہ وہ اپنا فرض پورا نہ کرپاتا لیکن متلی کا احساس ٹھیک طرح سے کام کرنے بھی نہیں دے رہا تھا۔

وہ اسکول کی عمارت میں داخل ہوا۔ دوسری منزل تک اسے دہشت گردوں کی

وحشتوں کی کوئی نشانی نظر نہیں آئی لیکن تیسری منزل کے زینوں سے جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں داخل ہوگیا۔ سیڑھیوں پر خون کے سوکھے ہوئے گاڑھے دھبے تھے۔ راہداری میں شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ بائیں جانب والی دیوار پر گولیوں کے کئی سوراخ تھے۔ جابجا پلاسٹر ادھڑا ہوا تھا۔ ریسٹ روم میں سب سے زیادہ خون بہا تھا۔ یقینی طور پر کارروائی کے دوران میدان جنگ وہی بنا تھا۔ کھڑکیوں کی چوکھٹوں پر بھی خون کے دھبے تھے۔ باتھ روم کا حال بھی تباہ تھا۔ آئینے ٹوٹے ہوئے تھے اندازہ ہوتا تھا کہ سو سے زیادہ گولیاں وہاں آئی ہوں گی۔ فیکلٹی لاؤنج مجرموں کا کمانڈ سینٹر تھا۔ وہاں جابجا کافی کے پیپر کپ اور پیپر پلیٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ مڑے تڑے ٹشو پیپرز کا بھی ڈھیر تھا۔ ہر ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹوں سے لبالب بھری ہوئی تھی لیکن اس کمرے میں فائرنگ کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اسے بے انصافی کا احساس ہونے لگا۔

کلاس روم نمبر۲۱ میں وہ سب سے آخر میں گیا۔ اس کمرے کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ کمرے میں ابتری ہوگی کیونکہ یہی وہ کمرا تھا' جہاں سے یرغمالی طلباء افراتفری کے عالم میں بھاگے ہوں گے لیکن کمرے میں بس معمولی سی بے ترتیبی تھی۔ اس کا کریڈٹ یقینی طور پر ٹیچر کو جاتا تھا۔ بچ نکلنے والے طلباء نے بتایا تھا کہ کمال رشید بدترین صورت حال میں بھی پرسکون رہا تھا۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود اس نے ہر موقع پر ہوش مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کمرے کو دیکھ کر اسے طلباء کی بات پر یقین آگیا۔

وہ اس کھڑکی کی طرف رکا' جہاں لڑکی کو شوٹ کرنے کے بعد نیچے پھینکا گیا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا لیکن اس کی نیچے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے سر داہنی طرف گھمایا اور ایک طرف نظریں جمادیں لیکن درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا لیکن اچانک ایک تحرک نے اس کی نظروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ اس نے تحرک کی سمت دیکھا۔ وہ ایک نوتعمیر شدہ اپارٹمنٹ ہاؤس کی کھڑکی تھی۔ شاید اس نے کوئی پردہ ہلتے دیکھا تھا...... ہوا کی وجہ سے؟ لیکن نہیں' کھڑکی تو بند تھی۔ تو پھر؟

وہ کھڑکی سے پلٹا اور اس نے اپنے واکی ٹاکی کی طرف ہاتھ بڑھایا اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی اور اس کے نتیجے میں سینے میں ہونے والا درد زور پکڑ گیا تھا۔ اس نے

اپنی تکلیف کو نظرانداز کردیا۔ یہ امکان بہت اہم تھا کہ مجرموں کی باہر کی ساتھی کو پکڑا جاسکتا ہے۔

"انسپکٹر ارشاد.......... یہ جو اس سڑک پر کشمیر ویو اپارٹمنٹس ہیں' انہیں دوبارہ چیک کیا گیا یا نہیں؟" اس نے ریڈیو میں پوچھا۔

"ہم چیک کرنے ہی والے تھے سر کہ علاقہ خالی کرنے کا حکم مل گیا۔"

"اسے پہلے چیک کیا گیا تھا؟"

"جی ہاں سر۔"

"بلڈنگ سے کوئی نکلا بھی تھا؟"

"میں لسٹ چیک کرکے بتاتا ہوں سر" دوسری طرف سے کہا گیا پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد انسپکٹر ارشاد کی آواز ابھری۔ "پانچ فلیٹوں کے علاوہ سب خالی تھے جناب۔ چار میں سے ہم نے لوگوں کو نکالا۔ پانچویں فلیٹ کے لوگ کہیں گئے ہوئے تھے۔ ہماری دستک کے جواب میں دروازہ نہیں کھلا۔"

"وہ کون سا فلیٹ تھا؟"

"فلیٹ نمبر تیرہ سر۔"

"تیسری منزل پر بائیں جانب والا تو نہیں.......... جس کی کھڑکی یہاں سے نظر آتی ہے؟"

"میرا خیال ہے.......... جی ہاں سر' یہ وہی فلیٹ ہے۔ کیوں سر؟"

"اپنے آدمی لے کر فوراً جاؤ اور اس فلیٹ کو چیک کرو۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے اس کی کھڑکی میں کسی کو حرکت کرتے دیکھا ہے اور ہاں' محتاط رہنا.......... اگر یہ وہی لڑکی ہے تو میں اسے زندہ سلامت اپنے روبرو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بہت بہتر سر۔"

ایک لمحے سوچنے کے بعد جلیس نے کہا "ارشاد۔ میں پولیس کا مزید جانی نقصان نہیں چاہتا۔"

"ہم محتاط رہیں گے سر۔"

جلیس نے واکی ٹاکی کا بٹن دبایا اور مضطربانہ انداز میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسے
ین تھا کہ یہ وہی لڑکی ہوگی' جس کی آواز اس نے بابر سے بات چیت کے دوران سنی
ی.......... ریڈیو پر اور وہ ان تمام مجرموں کو گرفتار دیکھنا چاہتا تھا اور یہ لڑکی ان کی
رفتاری میں کلیدی کردار ادا کرسکتی تھی۔ اس خواہش کے پیچھے انتقامی جذبہ بھی کارفرما
ا۔ مجرموں نے خود کو بہتر دہشت گرد ثابت کیا تھا۔ جبکہ وہ خود کو بہتر پولیس آفیسر ثابت
ہیں کرسکا تھا۔ انہوں نے اس بات سے فائدہ اٹھایا تھا کہ پولیس دہشت گردی کا سامنا
رنے کے لئے کبھی پوری طرح تیار نہیں ہوتی جبکہ دہشت گردوں کو اپنی دھمکیوں پر
ل کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی اور پولیس اپنی مرضی کے مطابق آزادانہ کارروائی
ہیں کرسکتی۔ اس کا بس چلتا تو اس نے یرغمالیوں کی پرواہ کئے بغیر عمارت پر دھاوا بول دیا
تا۔ جبکہ یرغمالیوں میں اس کا اکلوتا بیٹا بھی تھا۔ پہلی بار اس کے ضمیر کا بوجھ کم ہوا۔
قی.......... اس نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے مجرموں کے خلاف کارروائی کا منصوبہ
ہیں بنایا تھا۔ بلکہ اس طرح تو اس نے الٹا اپنے بیٹے کی زندگی کو خطرے میں ڈالا تھا لیکن
پر والوں کا فیصلہ کچھ اور تھا اور اب بھی اسے کئی معاملات میں جواب دہی کرنا تھی۔ اس
نے مجرموں کے خلاف آپریشن کیوں کیا؟ اس نے احکامات کی خلاف ورزی کیوں کی؟ وہ
انتا تھا کہ اس کے خلاف کارروائی ہوگی۔ مجرموں کے حصے کی سزا بھی وہ بھگتے گا۔ پبلک
ے لئے بھی دہشت گردوں کے ہاتھوں معصوم لوگوں کے قتل عام کی اتنی اہمیت نہیں تھی
نی پولیس کی کارروائی کے دوران خون بہنے پر پولیس کو مطعون سمجھتا تھا۔ یہی رویہ تو
ہشت گردی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچے گا کہ دہشت گردوں کے
ھوں پانچ بے گناہ افراد مارے گئے ہیں اور پھر بھی وہ آزاد ہیں بلکہ انہیں پانچ کروڑ روپے
عام بھی ملا ہے اور جس شخص نے ۳۰ گھنٹے ہر لمحے عذاب بھگتا ہے اور انسانی جانوں کو
ہانے کے لئے سر مارا ہے' اسے اپنے بے داغ کیریئر کے داغدار انجام کی سزا ملے گی۔
ل پر سب لعن طعن کریں گے.......... ارباب اقتدار بھی اور عوام بھی۔ اس کے ہر عمل
.... ہر عذاب ناک لمحے کا یک طرفہ احتساب کیا جائے گا۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ۔ وہ
پنے ضمیر کی طمانیت کے لئے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتا تھا پھر چاہے اس کا کچھ

بھی انجام ہو۔ اپنا آپ مطمئن ہو گا تو اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں ہو گی۔ اس کے لئے لڑکی کا پکڑا جانا بہت ضروری تھا۔ اس سے دوسروں کے متعلق......... مجرموں کے منصوبے کے متعلق اہم معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔

☆============☆============☆

ویگن میں کمال' رئیس اور مظفر ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے والی سیٹ پر مشکور شاٹ گن لئے بیٹھا تھا اور سب سے پچھلی سیٹ پر صوفیہ' شہلا کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کمال' رئیس سے وہ چاقو طلب کرنا چاہتا تھا' جس سے پردہ کاٹ کر ڈوریاں بنائی گئیں تھیں۔ وہ چاقو رئیس نے اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا لیکن مشکور آگے کی طرف جھکا بیٹھا تھا۔ کمال' رئیس سے کچھ کہتا تو وہ بھی سن لیتا۔

کمال کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے بابر سے اس درجہ نفرت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کا وجود پھنکنے لگا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑے اور اس کے وجود میں سے زندگی کی آخری رمق بھی کھینچ لے لیکن اس میں اتنی طاقت نہیں تھی اور ایسی کوشش کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ بابر نے ہر طرح سے اسے توڑ پھوڑ دیا تھا اور آخر میں نازیہ کو قتل کر کے اس نے اس کی فیصلہ کن توہین کر دی تھی۔ اسے اپنی نظروں میں ذلیل ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

کمال کے لئے یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ نازیہ مر چکی ہے۔ وہ فائر کی آواز سن کر ہوش میں آیا تھا اور جیسے تیسے گرتا پڑتا باہر نکلا تھا لیکن وہ کلاس روم تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ نذیر اس کے پیچھے چلا آیا تھا اور اسے پکڑ لیا تھا۔ اس میں زیادہ مزاحمت کی طاقت بھی نہیں تھی۔ لہٰذا نذیر کو اس پر قابو پانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی پھر اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی اور وہ نیچے گر گیا تھا۔ اس وقت بابر کلاس روم سے نکلا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بھیانک طمانیت نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے آ کر رکا اور مسکرایا۔ اس کا بالائی ہونٹ اوپر اٹھا اور دانت جھانکنے لگے۔ اس وقت وہ بھیڑیا لگ رہا تھا۔

کمال نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ اس کا گلا دبوچنا چاہتا تھا لیکن ایک تھپڑ نے اسے فرش چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ بابر اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ نہ اس نے کچھ کہا'

نہ اس نے کچھ کہا۔ بس وہ اسے ذلیل کرنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کمال کچھ کرنا چاہتا تھا مگر اس میں ہاتھ ہلانے کی طاقت بھی نہیں تھی۔

یہ خیال بہت اذیت ناک تھا کہ صورت حال پوری طرح بابر کے کنٹرول میں ہے۔ شیطانیت' نیکی پر غالب آ رہی ہے۔ یہ شخص قدم قدم پر انسانیت کی توہین کر رہا ہے۔ اسے پامال کر رہا ہے۔ معصومیت کو داغ دار کر رہا ہے اور اسے روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ انسانیت اپنے اصولوں میں اتنی کمزور ہے کہ اس بھیانک شیطانیت سے نہیں لڑ سکتی۔

اس موقع پر بابر نے اسے بخش دیا تھا۔ اس نے لاتوں سے......... گھونسوں سے اس کی تواضع نہیں کی تھی۔ اس نے کہا تھا "اس کے بعد تمہاری باری ہے" اور پھر وہ چلا گیا تھا اور کمال جانتا تھا کہ اس نے سچ کہا ہے۔

اس کے بعد بے بسی کے احساس نے اس کے ذہن کو جکڑ لیا تھا۔ اس کی کمزوری میں اضافہ ہو گیا تھا۔

انہوں نے دونوں لڑکوں کے ایک ایک ہاتھ کو ملا کر رسی سے باندھ دیا تھا پھر انہوں نے ڈائنا مائٹ اسٹکوں کا ایک پیکٹ رئیس کی کمر سے باندھ دیا تھا۔ رسی کی گرہیں ایسی باندھی گئی تھیں کہ طویل کوشش کے بغیر انہیں کھولا نہیں جا سکتا تھا۔ دوسرا پیکٹ انہوں نے اس کی پشت سے باندھ دیا تھا۔ صوفیہ کے بھی ہاتھ باندھ دیے گئے تھے۔ ٹریگر ڈیوائس فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بابر کی گود میں رکھی تھی۔ اس نے ان لوگوں کو انسانی بم میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس نے واضح کر دیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہ صرف ایک بٹن دبائے گا اور ان کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔

کمال کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ایسی بے بسی تو اس نے جنگی قیدیوں کے بھارتی کیمپ میں بھی نہیں محسوس کی تھی۔ جسمانی اذیت بھی کچھ کم نہیں تھی۔

وہ راولپنڈی کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ ذرا دیر بعد ایئرپورٹ کی بلڈنگ نظر آنے لگی تھی۔ دور رن وے پر ایک اکیلا طیارہ کھڑا تھا۔ رن وے کی طرف جانے والا راستہ صاف تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔

☆============☆============☆

شہناز نے سٹنگ روم میں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کررہی تھی کہ اسے نہیں دیکھا گیا ہے۔ اس نے ریڈیو کو ٹرائی کیا اور دیر تک بابر کو پکارتی رہی۔ اسے یقین تھا کہ وہ جواب دے گا۔ اسے دلاسہ دے گا اور اور سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا لیکن ریڈیائی لہروں کی سرسراہٹ کے سوا اسے کوئی آواز نہیں سنائی دی۔

پھر اسے خیال آیا کہ ویگن اب تک یقیناً دور نکل چکی ہو گی۔ اب ریڈیو پر رابطہ ممکن نہیں۔ اب وہ اکیلی ہے۔ وہ اٹھ کر بیڈ روم میں چلی گئی۔ بیڈ اور دیوار کے درمیان دبک کر اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس کی طرح صورت حال کے لئے بابر نے اسے کیا ہدایات دی تھیں۔

"ہم میں سے کسی کو بھی زندہ پولیس کے ہاتھ نہیں آنا چاہئے" اس کی سماعت میں بابر کے الفاظ گونجے۔

اس وقت شہناز نے یہ عہد کرلیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب اس کا جینا مرنا اس گروپ کے ساتھ ہے۔ وہ سب ساتھ جئیں گے' ساتھ مریں گے لیکن اب معاملہ مختلف تھا۔ اگر سب مررہے ہوتے تو زندگی اسے بے کار شے محسوس ہوتی لیکن اب وہ سب محفوظ تھے اور وہ خود اکیلی بھی تھی اور خطرے میں بھی۔ اس نے بیلٹ سے ریوالور کھینچا اور عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ یہ وہی ریوالور تھا جس سے اس نے ایک معصوم شخص کو قتل کیا تھا۔ جو اپنی بیوی کے ساتھ فلم دیکھ کر سینما سے باہر نکل رہا تھا۔ اس وقت وہ قتل ضروری معلوم ہوا تھا۔ اس کے بغیر وہ گروپ میں شامل نہیں ہوسکتی تھی لیکن اب.......... اب اسے یقین نہیں رہا تھا۔ اب وہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ کسی پر گولی چلا سکتی ہے۔ اب وہ سوچ رہی تھی' کاش ایسی نوبت ہی نہ آئے۔

فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کلاس روم نمبر ۲۱ کی کھڑکی میں کھڑے شخص نے اسے دیکھا ہے یا نہیں پھر وہ تو خاص طور پر اس طرف دیکھ رہی تھی.......... اس شخص کو لیکن وہ شخص تو خصوصیت سے اسے نہیں دیکھ رہا ہوگا۔ اس شخص کے سامنے تو ایک پھیلا ہوا منظر تھا اور وہ کھڑکی سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑی تھی.......... اور زیادہ روشنی بھی نہیں تھی۔ غروب آفتاب کا وقت تھا۔ آسمان پر گھٹا بھی

تھی۔ اس کے باوجود یہ ناممکن نہیں کہ دوربین کے شیشوں سے ہلکی روشنی منعکس ہوگئی ہو۔

یہ سب کچھ سوچ کر وہ خاصی مطمئن ہوگئی۔ اس حد تک کہ وہ محتاط انداز میں ہی سہی' بیڈ روم سے باہر چلی آئی۔ وہ سٹنگ روم میں آئی لیکن فوراً ہی دہشت زدہ بھی ہوگئی۔ دروازے کا لٹو کھڑکھڑایا.......... پھر گھوما۔ اس نے ریوالور بلند کیا اور اس کا رخ دروازے کی طرف کردیا۔

اس کے بعد کیا ہوا' وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ دروازہ دھماکے سے اس قدر اچانک کھلا کہ اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکل گئی لیکن اس نے دروازہ کھلنے کی آواز نہیں سنی۔ کیونکہ اس سے پہلے ہی وہ ٹریگر دبا چکی تھی اور وہ ٹریگر دباتی چلی گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ کئی افراد قلابازیاں کھاتے ہوئے اندر گھسے ہیں۔ سب کچھ دھندلا گیا تھا۔ رنگین شعلے رقص کررہے تھے۔ فائرنگ کا شور سماعت معطل کردینے والا تھا۔ اس نے اپنی چیخ سنی۔ ایک گولی اس کے جسم میں اتر گئی تھی۔ وہ پیچھے کی طرف پہلو کے بل گری۔ دیوار جیسے خود اس کی طرف جھپٹی اور اس سے ٹکرائی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ اس نے خود کو گرنے سے روکنے کی کوشش کی لیکن فرش کے جھپٹنے کی رفتار بہت تیز تھی اور جھٹکا بہت شدید تھا۔

☆------------☆------------☆

نذیر نے ویگن کو تیز رفتاری سے موڑ کر گیٹ سے گزارا۔ کمال کا زخمی کندھا برابر بیٹھے ہوئے مظفر سے ٹکرایا۔ درد کی ایک مہیب موج اسے ڈبو گئی۔ ویگن اب رن وے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ کمال نے بڑی جدوجہد کے بعد اپنا زخمی کندھا ہٹایا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ ویگن کی رفتار بہت تیز تھی اور اس کا رخ سیدھا جہاز کی طرف تھا۔ جبکہ رن وے کی طرف کوئی سڑک نہیں جاتی تھی' نذیر ویگن کو کچے میں تیز رفتاری سے دوڑا رہا تھا۔ جھٹکے بہت شدید تھے۔

ایک اور جھٹکا لگا۔ ویگن ایک لمحے فضا میں معلق رہی اور پھر رن وے پر دوڑنے لگی۔

بالآخر ویگن رک گئی۔ کمال نے سکون کی سانس لی۔ نذیر نے انجن بند کیا۔ وہ چند منٹ ویگن میں بیٹھے رہے۔ بابر جہاز کے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا پھر اس نے مشکور کو حکم دیا کہ وہ جاکر جہاز کو چیک کرے پھر اس کی ہدایت پر شہلا صوفیہ کو آگے لے آئی اور اس نے صوفیہ اور کمال کے ایک ایک ہاتھ کو ویسے ہی باندھ دیا' جیسے مظفر اور رئیس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ کمال کا بایاں ہاتھ صوفیہ کے داہنے ہاتھ سے باندھا گیا تھا اور یہ بات تکلیف دہ تھی۔

"ذرا سا بائیں جانب ہٹ جاؤ۔" کمال نے کراہتے ہوئے صوفیہ سے کہا۔

وہ بائیں جانب ہٹ گئی "بہت تکلیف ہو رہی ہے؟"

کمال نے پہلو بدلا اور قدرے پرسکون ہوگیا "پہلے کے مقابلے میں تو بہت کم ہے" اس نے جواب دیا۔

وہ اسے غور سے دیکھنے لگی "تم ٹھیک تو ہونا؟"

وہ بہت خوف زدہ نظر آرہی تھی۔ کمال کو احساس ہوا کہ اس کا چہرہ کتنا زرد ہوگیا ہے۔ اس کے رخسار بھی اندر کو دھنس گئے تھے۔ لگتا تھا' اس کا وزن بھی کم ہوا ہے۔ تمام دن وہ خاموش رہی تھی اور وہ اب وجہ بھی سمجھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کا خالی پن اور ویرانی بتا رہی تھی کہ وہ شاک کی حالت کے بہت قریب پہنچ چکی ہے۔

"کمال.......... اس نے نازیہ کو مار ڈالا" صوفیہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ کمال نے حیرت سے سوچا.......... یہ تو اپنی عمر سے بڑی لگ رہی ہے۔ وہ پرانی صوفیہ تھی ہی نہیں۔ اس کے بالوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی اور اب وہ چپکے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے تھے۔ اس پر ترس آنے لگا۔ وہ اسے چھونے کے لئے ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک گیا۔ جو کچھ ہوا تھا' اس نے اس کے درمیان ایک دوری سی پیدا کردی تھی.......... ایک بے نام سی کشیدگی۔ وہ اس سے کچھ دور ہوگیا۔

"میرا خیال ہے صوفیہ' اب ہمیں اس امکان کو قبول کرلینا چاہئے" وہ بولا.......... "کہ یہ لوگ ہم سب کو قتل کردیں گے۔" اس کے لہجے میں سفاکی تھی "مجھے یقین نہیں

ہم انہیں روک سکیں گے۔ مجھے بھی نازیہ کی موت کا دکھ ہے لیکن فی الحال میں اس میں ڈوبنا نہیں چاہتا۔ ابھی ہمیں اپنے تحفظ کے متعلق سوچنا ہے" اسے احساس تھا کہ محض خالی خولی' کھوکھلے لفظ ہیں۔ اس کے پاس تحفظ کے متعلق سوچنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا.......... نہ کوئی امکان' نہ کوئی خواب۔

صوفیہ نے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ تو نازیہ کے خیال میں ہی گم تھی "ہمیں ہر حال میں اسے پہلے نکال دینا چاہئے تھا" وہ بڑبڑائی۔

"صوفیہ تم بھول رہی ہو کہ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ اس مرحلے سے گزر نہیں سکتی تھی۔ گر کر مر جاتی" کمال نے تحمل اختیار کرنے کی کوشش کی "یہ خواہ مخواہ ضمیر پر بوجھ لادنے کا وقت نہیں ہے۔"

اس وقت مشکور واپس آیا اور اس نے ان لوگوں کو ویگن سے اترنے کا اشارہ کیا۔

ویگن سے اترتے ہوئے کمال نے پولیس کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بابر نے جہاز کے لئے بہت محفوظ جگہ منتخب کی تھی۔ وہ رن وے کا دور دراز کا حصہ تھا۔ اردگرد کا کم از کم آدھا میل کا حصہ پوری طرح نظروں کے سامنے تھا اور وہاں کسی کے چھپنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے اتنے فاصلے سے فائر کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ سرپرائز اٹیک کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ بابر کارروائی کے لئے پیش قدمی کرنے والوں کو دور سے ہی دیکھ سکتا تھا۔

"یعنی صورت حال اس قدر مایوس کن ہے۔ کیا ان لوگوں کو روکنے کی کوئی کوشش تک نہیں کی جائے گی؟" کمال نے اداسی سے سوچا۔

☆------------☆------------☆

ایس پی جلیس جانتا تھا کہ وقت اس کے ہاتھوں سے پھسلا جارہا ہے۔ وہ دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھ رہا تھا لیکن یہ احساس بہت توانا تھا کہ کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ لینڈنگ پر وہ رکا اور اس نے دکھتے ہوئے سینے کو ہاتھ سے دبایا لیکن وہ رک نہیں سکتا تھا۔ اس نے اتنے فائروں کی آواز سنی تھی کہ لڑکی کا زندہ ہاتھ لگنا ناممکن ہی نظر آرہا تھا۔ کاش..........

کاش............!

وہ فلیٹ میں داخل ہوا تو اسے لڑکی سٹنگ روم میں دور کی دیوار کے پاس بکھری نظر آئی۔ اس کے دل کو جھٹکا لگا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اس نے کرسی کا سہارا لیا اور خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے دل کی حالت اچھی نہیں ہے۔

پھر اسے ایک امید افزا بات نظر آئی۔ لڑکی سانس لے رہی تھی!

انسپکٹر ارشاد اس کی طرف بڑھا۔ وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "آپ ٹھیک تو ہیں سر!" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

جلیس نے کرسی سے ہاتھ ہٹایا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ "میں ٹھیک ہوں" اس نے کہا "یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

انسپکٹر نے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس نے ہمیں موقع ہی نہیں دیا سر۔ اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ مجبوراً ہمیں گولی چلانی پڑی۔"

جلیس اب خود کو سنبھال چکا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل شہناز کے پاس بیٹھ گیا۔ اسے حیرت ہوئی۔ لڑکی کم عمر بھی تھی اور خوب صورت بھی۔ عام طور پر ایسے کاموں میں ملوث ہونے والی لڑکیوں کے چہروں پر کرختگی نظر آتی ہے' نرمی اور خوبصورتی نہیں۔ "تم نے ایمبولینس منگوائی ہے؟" اس نے انسپکٹر سے پوچھا۔

"جی ہاں سر۔"

جلیس نے زخم کا جائزہ لیا۔ گولی پہلو میں لگی تھی اور باہر نہیں نکلی تھی۔ ورنہ دوسرا زخم بھی نظر آتا............ گولی کے باہر نکلنے کا اور اتنے کم فاصلے سے چلائی جانے والی گولی کو بہرحال باہر نکلنا چاہئے تھا۔ نہ نکلنے کا مطلب یہ تھا کہ گولی جسم کے اندر کسی ٹھوس چیز سے ٹکرائی ہے۔

"فائر کرتے وقت تم کہاں تھے؟" اس نے انسپکٹر ارشاد سے پوچھا۔

"وہاں............ فرش پر گرا ہوا تھا" انسپکٹر ارشاد نے بتایا۔

"اور لڑکی اس جگہ کھڑی تھی............؟"

"دیوار سے ذرا آگے............"

"تو گولی ترچھی اور اوپر کی سمت گئی ہوگی" جلیس نے کہا۔ وہ گولی سے پہنچنے والے نقصان کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولی جگر سے یا داہنی جانب کے گردے سے ٹکرائی ہوگی اور اوپر اٹھتے ہوئے معدے سے گزر کر بائیں پھیپھڑے میں گھسی ہوگی۔ یعنی پسلیوں کے عقبی پنجر میں الجھ گئی ہوگی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ تھام کر دیکھا۔ نبض بہت کمزور تھی۔ سانسیں بھی اتھلی تھیں۔

لڑکی کے بچنے کا امکان بہت ہی کم تھا۔

"میں اسکول واپس جا رہا ہوں" اس نے انسپکٹر سے کہا "تم اسے اسپتال لے جاؤ۔ ڈاکٹر سے کہنا کہ میرا اس سے بات کرنا ضروری ہے۔ وہ کچھ بھی کرے۔ مجھے اس سے جلد از جلد بات کرنی ہے۔"

"او کے سر۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھا لیکن باہر نکلتے نکلتے رک گیا۔ صوفے پر اسے ریڈیو پڑا نظر آیا۔ اس نے ریڈیو اٹھایا اور کھڑکی کی طرف چل دیا۔ کھڑکی کے سامنے کرسی پڑی تھی۔ کرسی پر ایک دوربین اور ایک نائٹ اسکوپ رکھا تھا۔ اس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر اسکول کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں اسٹیڈیم سے ہوتی ہوئی اسکول کی عمارت کی طرف بڑھیں۔ بابر نے یقینی طور پر بہت اچھے فلیٹ کا انتخاب کیا تھا۔ یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ اس کا منصوبہ عین موقعے پر کیوں ناکام ہوا۔ لڑکی نے نائٹ اسکوپ کی مدد سے اسکول کی چھت پر جوانوں کو دیکھا ہوگا اور ریڈیو کے ذریعے بابر کو خبردار کر دیا ہوگا۔

اس نے ریڈیو بھی کرسی پر رکھ دیا اور فلیٹ سے نکل آیا۔

وہ اسکول پہنچا' جہاں لڑکی کی لاش اٹھائی جا چکی تھی۔ بم ڈسپوزل اسکواڈ والوں نے ایک زینے سے بندھا ہوا ڈائنا مائٹ چارج کھول کر اسے بے کار بنا دیا تھا۔ یہ چارج مجرم چھوڑ گئے تھے۔ باقی دونوں چارجز وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ دوبارہ تیسری منزل کی طرف چل دیا۔ اس امید پر کہ شاید وہاں اسے کوئی ایسا سراغ مل جائے جس سے کچھ مدد مل سکے لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

نیچے آنے سے پہلے اس نے بم ڈسپوزل اسکواڈ والوں سے بات چیت کی۔ انہوں نے اسے چارج کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ وہاں سے وہ نیچے پرنسپل کے کمرے میں آیا۔ اسے ایک فون کرنا تھا۔ وہاں.......... پرنسپل جمیل الرحمٰن کو بیٹھے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس نے کرسی گھسیٹی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

جمیل الرحمٰن چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا "تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ کیا بات ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ بس تھکن ہے۔"

"ہاں.......... آرام کی ضرورت تو ہم سبھی کو ہے اور سناؤ' وہ لڑکی پکڑی گئی؟"

جلیس نے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا "ہاں' لیکن میرا خیال ہے' وہ زیادہ دیر جی نہیں سکے گی۔"

"اوپر کوئی کام کی چیز ملی؟"

"نہیں' کچھ بھی نہیں۔"

جمیل الرحمٰن بھی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں ابھر آئی تھیں لیکن وہ خوش تھا کہ اسکول کی عمارت سے وبال ٹل گیا ہے۔ جلیس کو وہ اچھا لگا تھا۔ وہ اس سے مرنے والی طالبہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے محسوس کرلیا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پرنسپل سمجھ دار آدمی تھا۔ وہ ذمے داری سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ جلیس جو کچھ کرسکتا تھا' وہ اس نے کیا ہے لیکن کامل تو کوئی انسان نہیں ہوتا۔

"جلیس.......... آپ کو آپ کا اسکول مل گیا" اس نے کہا۔

"لیکن ابھی کلاسیں نہیں ہوسکیں گی۔ اسکول کھلنے میں دو تین دن لگیں گے"

جمیل الرحمٰن نے کہا "کھڑکیوں کے نئے شیشے لگوانے ہیں۔ دھلائی اور صفائی کرانی ہے۔ بعض کمروں میں دوبارہ رنگ و روغن کرانا ہوگا۔ جن دیواروں میں گولیوں کے سوراخ ہوئے ہیں' وہاں پلاسٹر کرانا ہوگا۔ اس کے باوجود تین چار دن تک یہاں کی فضا نارمل نہیں ہوسکے گی۔ ایسے المیوں کا تاثر آسانی سے نہیں مٹتا۔ بدقسمت کلاس کے طلباء کو تو میں نے دو ہفتے کی چھٹی دے دی ہے۔ تمہارا بیٹا بھی دو ہفتے گھر پر ہی رہے گا۔"

جلیس نے سگریٹ سے سگریٹ سلگائی "یہ ہے تو اس کی بہتری کے لئے" وہ بولا "لیکن نعمان مجھے یقین ہے کہ اسے پسند نہیں کرے گا۔ یہ تو اس کے لئے توجہ کا مرکز بننے کا موقع تھا۔"

جمیل الرحمٰن نے اسے دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں اور میز پر رکھے کاغذات کی طرف متوجہ ہوگیا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر جلیس نے کہا "لڑکی کا باپ آگیا تھا۔ مجھے اس سے ملاقات بھی کرنی ہے۔"

"میں اس سے مل چکا ہوں۔ تمہارے لئے یہ ایک دشوار مرحلہ ہوگا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہوا؟ ہوا تو اس کے بچوں کے ساتھ کیوں ہوا؟ اور مجرموں کو روکا کیوں نہیں جاسکا؟"

جلیس نے سگریٹ بجھائی اور اٹھ کھڑا ہوا "مجھے معلوم ہے' اس کہانی کا ولن تو میں ہی ہوں۔" اب وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا "میں ان لوگوں سے یہیں نمٹ لینا چاہتا تھا۔ میرے پاس دو ہی راستے تھے۔ کچھ کروں یا کچھ بھی نہ کروں؟ اور کمال یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں میری کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنتا رہوں گا.........." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ خود ترسی میں مبتلا ہورہا ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ تم نے ہر ممکن کوشش کی اور بے حد خلوص سے کی" جمیل الرحمٰن نے پوری سچائی سے کہا "لیکن تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے اب تک متاثرہ طلباء کے جتنے والدین سے بات کی ہے' وہ سب پولیس کو ذمے دار ٹھہرا رہے ہیں۔ اس میں میڈیا کی کوریج کا بھی دخل ہے' جو پولیس پر اندھا دھند تنقید کو فرض سمجھتے ہیں۔"

جلیس پھر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگائی "میں جانتا ہوں۔ میرے دونوں اقدامات کو تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ عمارت پر دھاوا بولنا غیر ضروری رسک تھا اور تاوان کی ادائیگی کو ٹال کر مہلت حاصل کرنے کی کوشش حماقت بھی تھی اور حکم عدولی بھی لیکن میں جانتا ہوں کہ دونوں میں سے ایک کوشش بھی کامیاب ہوجاتی تو میں اس وقت ہیرو ہوتا' بہرحال میں حقیقت پسند آدمی ہوں۔ میں نے جوا کھیلا تھا اور ہار گیا۔ اب

قربانی کا بکرا بھی میں ہی بنوں گا' حکومت بھی اپنی بے اصولی کی ذمے داری مجھ پر تھوپ دے گی۔"

جمیل الرحمٰن نے بے حد خلوص سے کہا "میں اگر کسی بھی طرح تمہارے کام آسکتا ہوں تو ضرور بتاؤ' مجھے خوشی ہوگی۔"

جلیس نے مسکرانے کی کوشش کی "پیشکش کا شکریہ۔ یہ زخمی لڑکی میری آخری امید ہے' دعا کریں کہ میں اس سے معلومات اگلوا سکوں۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ مجھے فٹ بال بنادیا جائے گا۔ بہرحال میں اسے بھی جھیل جاؤں گا۔ ہم پولیس والے بڑی موٹی کھال کے ہوتے ہیں۔ ارے ہاں......... مجھے یاد آیا۔ میں ایک فون کرنے آیا تھا۔ اجازت ہے؟"

"ضرور۔"

جلیس نے نمبر ڈائل کیا۔ اپنے پُراعتماد لہجے کے برعکس وہ بہت پریشان تھا پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ احتساب کا خوف کتنا خوف ناک ہوتا ہے۔ دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز نے اس کی سوچوں کو منتشر کردیا۔ "لیفٹیننٹ سعید اسپیکنگ۔"

"انسداد دہشت گردی اسکواڈ سے؟ سنو میں ایس پی جلیس احمد بول رہا ہوں۔ میجر نصیر سے بات کراؤ۔"

چند لمحے بعد ریسیور پر میجر نصیر کی آواز ابھری "یس مسٹر جلیس۔ کیا صورت حال ہے؟"

"اسکول کی عمارت سے کوئی کام کی چیز نہیں ملی ہے۔"

"مجھے ایکسپلوزیوز کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

جلیس نے پنسل اٹھائی اور میز پر رکھے سادہ کاغذ پر یونہی لکیریں کھینچنے لگا "ہر چارج میں ڈائنامیٹ کی پندرہ اسٹکوں کو جوڑا گیا ہے اور وہ ریڈیو کنٹرول ڈیوائس سے منسلک ہیں" اس نے کاغذ پر بڑا سا ۱۵ لکھا "بم ڈسپوزل والوں کا خیال ہے کہ وہ ریموٹ کنٹرول ٹریگر استعمال کررہے ہیں' جیسا ہم لوگ ٹی وی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بم پھٹنے میں ذرا دیر نہیں لگے گی۔ یہ بڑا ڈھیلا ڈھالا سیٹ اپ ہے۔"

"یہ تو کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ اور کچھ؟"

"ہم نے ان کی ساتھی لڑکی کو پکڑ لیا ہے' جو قریب کی ایک بلڈنگ سے اسکول پر نظر رکھے ہوئے تھی۔"

"کچھ معلوم ہوا اس سے؟"

"نہیں۔ گرفتاری کے عمل میں وہ زخمی ہوگئی تھی' گولی لگی ہے اسے۔"

"یہ بھی بری خبر ہے۔ تو ان لوگوں کے متعلق کوئی خاص بات نہیں بتا سکتے؟"

"جو کچھ مجھے معلوم ہے' تم بھی جانتے ہو۔ یہ لوگ چالاک اور خطرناک ہیں۔ اب تک پانچ افراد کو قتل کرچکے ہیں اور ہماری ہر کوشش کو ناکام بنا چکے ہیں۔"

"ہم کوئی کارروائی نہیں کرسکتے؟"

جلیس نے کاغذ پر بڑے حروف میں "ناممکن" لکھا "سنو......... جس لڑکی کو ہم نے پکڑا ہے' اس نے بھی مزاحمت کی۔ اس لئے ہمیں گولی چلانی پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کارروائی کی گئی تو وہ جہاز کو اڑا دیں گے۔ ان کا انداز غیر ملکی تخریب کاروں کا سا ہے۔ یہ زندہ گرفتار نہیں ہونا چاہتے۔"

"کیسی بے بسی ہے۔ تم اپنی بے بسی مجھے بھی منتقل کررہے ہو۔"

"نہیں۔ اپنے تجربے کی روشنی میں تمہیں متنبہ کررہا ہوں۔ تم سوچو گے کہ مناسب موقع مل جائے تو تم ان پر قابو پاسکتے ہو لیکن میں بتا رہا ہوں کہ یہ تباہ کن ہوگا اور ایک مشورہ اور......... اوپر کے احکامات کی خلاف ورزی نہ کرنا۔"

"یہ بھی اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"یعنی انہیں عافیت سے نکل جانے دوں؟"

"سنو میجر۔ تمہاری طرح میں بھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ صاف بچ نکلیں لیکن میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی قربانی کا بکرا بنے" جلیس نے بے حد خلوص سے کہا۔

"مشورے کا شکریہ" دوسری طرف سے میجر نصیر نے سرد لہجے میں کہا "یہاں کی

صورت حال میرے سامنے ہے۔ میں دیکھ بھال کر اپنے طور پر فیصلہ کروں گا۔"

"گڈ لک۔ میں اب ہسپتال جارہا ہوں۔ معلومات حاصل ہوئیں تو میں تمہیں رِنگ کر دوں گا۔"

"سنو مسٹر جلیس.......... میں جانتا ہوں کہ تم نے بہت کڑا وقت گزارا ہے لیکن موقع ملے تو یہاں چلے آؤ۔"

جلیس اس پیش کش پر حیران رہ گیا "شکریہ میجر۔ میں کوشش کروں گا۔"

ریسیور رکھ کر وہ جمیل الرحمٰن کی طرف پلٹا "مجھے لگتا ہے کہ ساری دنیا میری مخالف ہوگئی ہے" اس نے کہا "کچھ فیصلے.......... ناگزیر فیصلے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے بعد آدمی مسلسل اس احساس سے دوچار رہتا ہے۔ مجھے آپ پر رشک آتا ہے سر۔ آپ کی پریشانیاں تو ختم ہوچکیں۔"

جمیل الرحمٰن نے سر اٹھا کر اسے دیکھا "پریشانیاں اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوتیں۔ ہاں' ان کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ دیکھو' مجھے اس عمارت کو ٹھیک ٹھاک کرانا ہے پھر مجھے اسکول کی سیکیورٹی کے لئے سوچنا ہوگا۔ یہاں بڑے بڑے لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ یہیں پڑھتے رہیں۔ کچھ لوگوں کے خیال میں یہ واقعہ اسکول کی بدنامی کا باعث بھی ہوا ہوگا۔ پریشانیاں میرے لئے بھی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جب تک باقی چاروں بھی رہا نہ ہوجائیں' میری پریشانیاں ختم نہیں ہوسکتیں۔ لہٰذا مجھ پر رشک نہ کرو۔"

جلیس کو شاک لگا۔ ان چاروں کا تو اسے دھیان بھی نہیں تھا۔ بھول گیا تھا انہیں۔ صرف اس لئے کہ اب وہ اس کی ذمے داری نہیں تھی!

☆==========☆==========☆

کیپٹن نوید حسن بوئنگ ۷۳۷ کے کنٹرول کے عقب میں بیٹھا تھا۔ وہ حیران تھا کہ دہشت گردوں نے اس جہاز کا ہی انتخاب کیوں کیا۔ اسے اس قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لئے امریکا میں خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ وہ اس طرح کے کئی بین الاقوامی معاملات نمٹا چکا تھا لیکن پاکستان میں یہ اس کی آزمائش کا پہلا موقع تھا۔

ویسے نوید نے اس بات کو اتنی اہمیت نہیں دی۔ اس کا خیال تھا کہ بیشتر دہشت گردوں کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کررہے ہیں۔ اسے اس بات سے فائدہ اٹھانے کی تربیت دی گئی تھی۔ وہ کئی بار ایسے جہاز اڑا چکا تھا اور جانتا تھا کہ آخر میں دہشت گرد بوکھلا جاتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ ایسے میں ان پر آسانی سے قابو پالیا جاتا ہے۔

اسے بس یہ فکر تھی کہ بوئنگ ۷۳۷ اس نے کم ہی اڑایا تھا۔ عام طور پر وہ زیادہ بڑے یا پھر بہت چھوٹے جیٹ اڑاتا رہا تھا۔ عام طور پر وہ بوئنگ ۷۴۷ اڑاتا تھا۔ وہ اس کی مشینری سے پوری طرح واقف تھا اور اس پر اس کا کنٹرول ہوتا تھا۔ یہ اس کے لئے ایک اہم بات تھی۔

وہ ائیر فورس سے ریٹائر ہوچکا تھا۔ وہاں اس نے کئی کارنامے انجام دیئے تھے۔ وہ بہت مہم جو اور خطر پسند پائلٹ تھا اور بعد میں اپنے ایڈونچرز کے متعلق دوسروں کو بتانا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ ایسی کسی مہم کے دوران وہ وہ مر بھی سکتا ہے' اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

جسیم اور تنومند مشکور شاٹ گن لئے جہاز میں آیا تو اس نے اس کی طرف توجہ بھی نہیں دی۔ اس نے انسداد دہشت گردی کے چیف کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ سیٹ کے نیچے ٹیپ کی مدد سے کوئی ریوالور نہیں چپکایا جائے گا۔ عملے میں کوئی جعلی فرد شامل نہیں ہوگا۔ جہاز میں کسی کو چھپایا بھی نہیں جائے گا۔

"آپ کو دہشت گردوں سے نمٹنے کے لئے جو کچھ کرنا ہے' باہر کریں۔" اس نے چیف سے کہا تھا "لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ان کے جہاز پر سوار ہونے کے بعد آپ کا کھیل ختم ہوجائے گا۔ میں جہاز کو اور اپنے عملے کو خطرے میں ڈالنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں جہاز اڑاؤں گا اور اپنے عملے اور یرغمالیوں کے تحفظ کے لئے جو کرسکا' ضرور کروں گا مگر آپ جہاز کے اندر کوئی اسکیم نہیں بنائیں گے۔"

یہی وجہ تھی کہ وہ پُراعتماد تھا۔ پائلٹ تو وہ تھا ہی لیکن اسے یقین تھا کہ وہ دہشت گردوں سے نمٹ سکتا ہے۔ وہ صرف نفسیاتی دباؤ کا قائل تھا۔ اس نے سر گھما کر مشکور کو

دیکھا اور اسے ویسے مخاطب کیا' جیسے اپنے عام مسافروں کو خراب موسم میں دلاسہ دیتا تھا "میرا خیال ہے' مسافروں کو بٹھاؤ اور چل دو۔ اس سے پہلے کہ قانون نافذ کرنے والوں کی نیت تم پر خراب ہو۔"

مشکور اس قسم کے معاملات میں تابعداری کا قائل تھا۔ اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور کیبن سے نکل گیا۔

نوید نے پائلٹ کو دیکھا اور مسکرایا "یہ تو بڑا بیبا بندہ معلوم ہوتا ہے۔" اس نے تبصرہ کیا "دیکھو نا کوئی پھوں پھاں کئے بغیر چلا گیا۔"

لیکن بعد میں اندر آنے والے منحنی جسم کے پستہ قامت شخص نے اسے بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس کے چہرے پر سختی اور بے رحمی تھی۔ جسم دبلا لیکن گٹھا ہوا تھا۔ اپنی آنکھوں اور چہرے سے قطع نظروہ غیر اہم اور عام سا آدمی تھا اور نوید کا تجربہ تھا کہ ایسے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہر لمحے الرٹ رہنا پڑتا ہے۔ یہ شخص اسے اچھا نہیں لگا۔ اپنی ظاہری شخصیت کی وجہ سے نہیں' جو بلاشبہ بدنما تھی۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اسے تنگ نظر اور آدم بیزار لگا تھا۔ یہ خرابی نوید کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ خود بھی ایسا ہی تھا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ غیر جانبدار رویے کا مظاہرہ کرے گا۔ شاید اس طرح صورت حال کچھ بہتر ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "ویلکم آن بورڈ۔ میں نوید حسین ہوں.......... تمہارا پائلٹ۔"

بابر نے بے تاثر نظروں سے اسے دیکھا "میں بابر ہوں.......... تمہارا دہشت گرد' تمہارا آقا۔"

نوید نے اسے غور سے دیکھا۔ ہونٹوں کی بناوٹ بتاتی تھی کہ وہ حس مزاح سے محروم ایک سفاک شخص ہے۔ "خیر.......... مجھے کیا' اس نے سوچا مجھے اس کے ساتھ عمر بھر تو نہیں رہنا" لیکن یہ طے تھا کہ اس شخص کا تذکرہ اس کہانی میں جان ڈال دے گا' جو نوید کو مشن کی تکمیل کے بعد اپنے دوستوں کو سنانا تھا۔ وہ بحران میں پرسکون رہنے والا' اور دماغ کو ٹھنڈا رکھنے والا آدمی لگتا تھا اور یہ اچھا تھا' ذراسی بات پر گھبرا کر فائر کھول دینے

والے دہشت گرد جہاز کے لئے بہت خطرناک ہوتے تھے۔

"جہاز بالکل کلین ہے۔ تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے۔" نوید نے اسے بتایا "ٹنکیاں فل ہیں اور میں پرواز کے لئے تیار ہوں۔ تم اپنے ساتھیوں سے کہو کہ پرسکون ہو کر بیٹھ جائیں۔ مجھے بھی اتنی دیر میں کچھ کام نمٹانے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مجھے ریمپ ہٹوانا ہے اور پھر کلیرنس لینی ہے۔"

"ریمپ کیسے ہٹواؤ گے؟"

"ایئرپورٹ کا عملہ آکر ہٹائے گا۔"

بابر نے نفی میں سرہلایا۔ "یہ کام تو تم اپنے کریو سے لوگے' باہر کا کوئی آدمی جہاز کے قریب بھی نہیں آئے گا اور سنو.......... میں فلائٹ سے پہلے ہی تم پر چند باتیں واضح کردینا چاہتا ہوں۔ میں نے اس جہاز کے کنٹرولز کے بارے میں سب کچھ جاننے میں بہت وقت صرف کیا ہے۔ تم کوئی گڑبڑ نہیں کرسکو گے مجھے بے خبر رکھ کر۔"

نوید نے کندھے جھٹک دیئے۔ جہاز کے عملے کے لئے ریمپ کو پرے دھکیل دینا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ تاہم وہ دہشت گرد کی بات پر غور کر رہا تھا۔ کسی بڑے جیٹ کے انسٹرومینٹس کے متعلق جاننے کے لئے ضروری تھا کہ دعوے دار نے پہلے بھی اس میں سفر کیا ہو۔ نوید کو یقین نہیں تھا کہ یہ بات ہے لیکن اس پر شک کرنا ٹھیک نہیں تھا کہ بابر واقعی اس جہاز کے بارے میں جانتا ہوگا۔ جو شخص دہشت گردی کی اتنی بڑی واردات کرکے کامیابی سے اس مرحلے تک پہنچا ہو' اس کے اہل ہونے میں شک نہیں کیا جاسکتا۔ نوید کا دہشت گردوں کے ساتھ کوئی چالبازی کرنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن یہ خیال اس کے لئے تکلیف دہ تھا کہ وہ چاہے بھی تو چال بازی نہیں کرسکتا۔

لیکن نوید ایسا آدمی نہیں تھا کہ بابر جیسے کسی آدمی کو خود کو چیلنج کرنے کی آسانی سے اجازت دیتا۔ "جس دوران میرا اسٹاف ریمپ ہٹا رہا ہے' میں بھی تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں" اس نے کہا "میں جانتا ہوں کہ تم میرے جہاز پر دھماکا خیز مادے لائے ہو۔ میں جانتا

ہوں کہ تم اسے چھوڑ کر فلائی کرنے پر رضامند نہیں ہو گے لیکن میری درخواست ہے کہ ٹیک آف کے بعد انہیں غیر موثر بنا دینا۔ کبھی کبھی جہاز عجیب کرتب دکھاتے ہیں اور موسم کی شعبدہ بازیاں الگ ہیں۔ جہاز میں کسی بھی وقت الیکٹریکل چارج پیدا ہو سکتا ہے اور ایسا ہوتے ہی سب کچھ ختم..........."

"تمہاری فکر مندی اور ذمے داری مجھے پسند آئی کیپٹن لیکن میرا جواب نفی میں ہے۔ یہ خطرہ مول لینا ضروری ہے۔" نوید خالی خالی نظروں سے خلا میں گھورتا رہا۔

"اور ہاں.......... تمہیں کنٹرول سے رابطہ کرکے میری آخری ہدایات ان تک پہنچانی ہیں۔" بابر نے کہا "ان سے کہو کہ تمام فلائٹس معطل کر دیں۔ مجھے کوئی جہاز اپنے تعاقب میں نظر نہیں آنا چاہئے۔ ورنہ اس جہاز کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ چلو، اب یہ ہدایات ان تک پہنچا دو۔"

نوید نے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے کنٹرول روم سے رابطہ کرکے یہ پیغام پہنچایا

"ایک منٹ کیپٹن نوید۔" کنٹرول روم سے کہا گیا "ہدایات ہم نے نوٹ کر لی ہیں۔ اب اس کیس کے انچارج میجر نصیر آپ سے بات کریں گے۔" اگلے ہی لمحے ہیڈ فون پر میجر نصیر کی آواز ابھری "کیپٹن.......... اگر اس وقت لائٹ چلی جائے اور میرے جوان کارروائی کریں تو ہماری کامیابی کا امکان..........."

"ایک فی لاکھ بھی نہیں ہے" کیپٹن نے کہا "میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا" اور اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ریمپ ہٹا دیا گیا تھا!

"ایک بات اور کیپٹن!" بابر نے کہا۔ "تم ابتدا ہی سے پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرو گے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارا یہ پرندہ کسی بھی ریڈار پر دیکھا جائے۔"

کیپٹن نوید کو حیرت ہوئی۔ تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆==========☆==========☆

کمال نے سیٹ سے پیٹھ لگائی اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ خوش تھا کہ پیٹھ پر سے ایکسپلوزیو کا بوجھ ہٹا دیا گیا ہے۔ ہاتھ بھی کھول دیا گیا تھا۔ اتنی سی دیر میں اس کی کلائی

دکھنے لگی تھی اور ہاتھ سوج گیا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی بے رحمی کا برتاؤ کیا گیا تھا۔ تاہم اس تکلیف سے ایک فائدہ ہوا تھا۔ اس کی توجہ اپنے کندھے کے زخم پر نہیں رہی تھی۔ صوفیہ دیکھ بھال کے باوجود کندھے کے زخم کو انفیکشن سے نہیں بچا سکی تھی۔ اسے اپنے بازو، کندھے اور وہاں سے پشت تک ایک دھڑکتی پھڑکتی آگ دہکتی محسوس ہو رہی تھی۔ بایاں بازو بالکل بے کار ہو چکا تھا۔ بس وہ اب ایک دکھتے ہوئے بہت بڑے پھوڑے کی طرح تھا جسے لٹکایا جاتا تو اذیت ہزار گنا بڑھ جاتی۔

لیکن بازو سے قطع نظر وہ جسمانی طور پر خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ چہرہ اور ناک اب نہیں دکھ رہے تھے۔ اب اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ ہر بار جب بھی وہ کھڑا ہونے کی کوشش کرے گا، بے ہوش ہو جائے گا۔ دوسری طرف صوفیہ بھی اب بہتر لگ رہی تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

صوفیہ نے اپنی سیٹ پر پہلو بدلا "اب ہم کیا کریں گے؟" اس نے پوچھا۔

کمال نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اپنی برہمی پر قابو پانے میں اسے کچھ دیر لگی۔ اس سوال نے اسے چڑا دیا تھا۔ وہ تھکا ہوا اور مضمحل تھا پھر زخم میں بھی تکلیف تھی۔ صورت حال اتنی خراب تھی کہ اگر اس کا ہاتھ بیکار نہ ہوتا تب بھی وہ کچھ کر نہ پاتا۔ ایسے میں ایسا فعال جملہ.......... اب ہم کیا کریں گے؟ وہ تو بس یہ امید ہی کر سکتا تھا کہ انہیں خود کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ بالآخر اس نے جواب دیا "جہاز سے اتریں گے، ٹیکسی روکیں گے اور گھر چلیں گے۔"

"پلیز.......... مجھے یہ احساس دلاؤ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" صوفیہ نے گڑگڑا کر کہا۔

کمال کو اپنے فرسٹریشن سے احساس ہو گیا کہ اس وقت وہ کسی سے بات کرنے کے قابل نہیں ہے "سنو صوفیہ۔ میں کوئی فلموں کا ہیرو نہیں ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہم کیا کرسکتے ہیں اور کیا کر سکیں گے۔ وقت آنے پر میں کچھ نہ کچھ کروں گا لیکن ابھی میرے پیچھے نہ پڑو" وہ کوشش کے باوجود اپنے لہجے کو تلخی سے پاک نہ کر سکا۔ اسے گزرے ہوئے دو دن یاد آ گئے۔ یاد آ گیا کہ وہ کتنی بھیانک صورت حال سے دوچار ہے۔ اب وہ

دہشت کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔ انسانوں کے جیتے جاگتے جسموں میں خوف کے کیڑے کس طرح سرسراتے ہیں' روح کی کس کس طرح تذلیل کی جاسکتی ہے' اس نے جان لیا تھا۔ وہ جنگ بھی لڑچکا تھا اور ہتھیار ڈالنے کی ذلت سے بھی واقف تھا۔ اس نے جنگ میں انسانوں کو خود بھی ختم کیا تھا لیکن وہ زمانہ جنگ تھا۔ وہ ۷۱ء کی بات تھی۔ فوج سے ریٹائرمنٹ لینے کے بعد اس نے عہد کیا تھا کہ اب کبھی خون نہیں بہائے گا۔ خواہ حالات کچھ بھی ہوں۔ اس عہد کی خاطر اس نے اپنے ماں باپ اور معصوم بہن کے قاتلوں کو بھی معاف کردیا تھا۔ اس نے ذہانت اور علم کو اپنا ہتھیار بنالیا تھا۔ وہ اپنی قوم کے بچوں کو اسی ہتھیار سے مسلح کررہا تھا۔ تو کیا اب.......... اب وہ اپنا عہد توڑ سکے گا۔ اپنے مظلوم ماں' باپ اور بہن کی روحوں کو شرمندہ کرے گا۔

اس نے صوفیہ کی طرف سے منہ پھیرا اور سونے کی کوشش کی لیکن اس سے سویا نہیں گیا۔

☆------------☆------------☆

اسپتال میں جلیس ٹہل رہا تھا۔ ڈاکٹروں کے ساتھ اس کا چڑچڑاپن بڑھتا جارہا تھا۔ اس نے ڈاکٹروں کو بتایا تھا کہ یہ کئی انسانی جانوں کا مسئلہ ہے لیکن ڈاکٹروں نے اسے لڑکی سے ملاقات کی اجازت نہیں دی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ لڑکی ہوش میں ہی نہیں ہے.......... نہ اس کی بات سمجھ سکے گی' نہ بول سکے گی تو ملاقات کا فائدہ؟

پچھلے ایک گھنٹے سے ڈاکٹر لڑکی کے پاس تھے۔ جلیس پریشان تھا کہ وقت نکلا جارہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی وقت دہشت گردوں کا جہاز ٹیک آف کرجائے گا۔ اس نے پے در پے چار سگریٹیں پھونک ڈالیں۔ ہر کش اس کے سینے کے درد میں اضافہ کررہا تھا۔ گزشتہ دو روز سے وہ جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کررہا تھا' وہ اب جواب دے چکا تھا۔ یہ خیال کہ لڑکی اسے معلومات فراہم کئے بغیر مرسکتی ہے اور یوں مجرم صاف بچ نکلیں گے' اس کے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا۔

بالآخر دروازہ کھلا اور ایک ڈاکٹر باہر آیا۔ جلیس کو دیکھ کر اس کا منہ بن گیا "میں لڑکی کی اہمیت کو خوب سمجھتا ہوں جناب" ڈاکٹر نے کہا "لیکن آپ یہ بات نہیں سمجھ

پارہے ہیں کہ صرف ہماری اور آپ کی خواہش سے لڑکی کی حالت بہتر نہیں ہوسکتی۔ کیس ہمارے ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔ اگر اس سے ملنا اتنا ہی اہم ہے تو آپ چند منٹ کے لئے اس سے مل سکتے ہیں لیکن زیادہ دیر نہ رکیئے گا۔ ہم آپریشن کی تیاری کررہے ہیں' اوکے؟"

جلیس نے سگریٹ نیچے گرا کر جوتے سے مسل دی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھے بغیر پوچھا۔ "اس کے بچنے کا امکان کتنا ہے؟"

"نہ ہونے کے برابر۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

پھر جلیس نے خود ہی دیکھ لیا کہ لڑکی کی حالت کتنی خراب ہے۔ لڑکی کی جلد اس قدر پیلی ہوگئی تھی کہ اس سے سبزی جھلکنے لگی تھی۔ ایسی رنگت اس نے سینکڑوں بار دیکھی تھی۔ صرف لاشوں میں۔ اس نے اپنی بڑھتی ہوئی تشویش سے لڑتے ہوئے لڑکی کو پُرسکون لہجے میں مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ "میں سپرنٹنڈنٹ آف پولیس ہوں۔ میرا نام جلیس احمد ہے۔ سن رہی ہو تم؟ مجھے تم سے کچھ ضروری سوالات کرنے ہیں۔"

لڑکی نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ اس کے ہونٹ خشکی سے تڑخ رہے تھے۔ آنکھوں میں دھندلاہٹ تھی۔

"وہ لوگ کہاں جائیں گے؟" جلیس نے پوچھا۔

ایسا لگا کہ لڑکی نے مسکرانے کی کوشش کی ہے پھر وہ بولی لیکن آواز اتنی دھیمی تھی کہ جلیس کو سننے کے لئے اس پر جھکنا پڑا۔ "تم تصور بھی نہیں کرسکتے کہ وہ کہاں جائیں گے۔"

"کہاں؟"

"یہ میں نہیں بتاسکتی۔" لڑکی نے ٹوٹتی آواز میں کہا۔

"سنو.......... ہمیں یرغمالیوں کو بچانے کی کوشش کرنی ہے۔ معصوم لوگ خطرے میں ہیں۔"

وہ مسکرائی۔ "اب انہیں مردہ ہی سمجھو۔ معصوم لوگ ہی مرتے ہیں۔ بعض کئی کئی بار۔ جیسے میں اب تک کئی بار مرچکی ہوں۔" وہ رکی پھر بولی۔ "بابر انہیں نہیں

چھوڑے گا۔ وہ شیطان ہے۔"

"اسی لئے تو کہتا ہوں' ہمارا ساتھ دو۔ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں نہیں کر سکتی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کیوں نہیں؟"

اب لڑکی سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ لفظ اس کے ہونٹوں پر ٹوٹ رہے تھے۔

"تم......... تم......... نہیں......... سمجھ......... سکو......... گے......... میرے......... پاس......... ان......... کے......... سوا......... کچھ......... نہیں......... بچا ہے۔"

جلیس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ اتنی پیاری لڑکی......... اور اس کا ان ننگ انسانیت وحشیوں کے سوا دنیا میں کوئی نہیں! اس کی شکست خوردگی اس لمحے حد سے گزر گئی تھی۔ "تم اپنا نام تو بتا دو۔" اس نے کہا۔

"سب سے......... پہلے......... میرا نام ہی تو مرا......... تھا۔" وہ بمشکل بولی۔

"ایک......... بات بتائیں......... گے؟"

"ہاں کیوں نہیں؟" جلیس نے گہری سانس لی۔

"کل بھی سورج......... غروب......... ہو گا نا؟"

"ہاں۔"

"مجھے......... بہت......... اچھا.........."

اسی وقت ڈاکٹر اندر آ گیا۔ "سوری آفیسر' اس سے زیادہ وقت نہیں مل سکتا۔ آپ کو......... ویسے بھی آپ کی کال ہے۔"

جلیس باہر نکل آیا۔ استقبالیہ کی طرف بڑھتے ہوئے وہ دعا کر رہا تھا کہ کاش اسے لڑکی سے بات کرنے کا ایک موقع اور مل جائے۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ "جلیس اسپیکنگ۔"

"میجر نصیر بول رہا ہوں۔ کچھ معلومات حاصل ہوئیں؟"

"نہیں۔ اس وقت وہ آپریشن تھیٹر لے جائی جا رہی ہے۔"

"برا ہوا۔ جہاز نے ابھی ٹیک آف کیا ہے۔"

درد جلیس کے سینے سے بائیں کندھے تک دوڑ گیا۔ ایک لمحے کو ایسا لگا' جیسے کسی نے اس کے دل کو مٹھی میں پوری قوت سے بھینچ لیا ہو۔ وہ جھکا اور اس نے گہری سانسیں لے کر درد سے لڑنے کی کوشش کی پھر اس نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔ "میں آ رہا ہوں۔" ریسیور رکھتے ہوئے اس نے سوچا کہ صبح وہ پہلا کام یہ کرے گا کہ کسی ہارٹ اسپیشلسٹ سے رجوع کرے گا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکی کو آپریشن تھیٹر لے جایا جا رہا تھا۔

☆============☆============☆

کمال جہاز کے ٹیک آف کا انتظار کرتے ہوئے عجیب کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اس کا ذہن خیالات کے بھنور میں کسی پہیے کی طرح تیز رفتاری سے گھوم رہا تھا۔ جب بھی وہ اسے روکنے کی کوشش کرتا' اسے درد کی کسی یاد کی ایک جھلک دکھائی دیتی اور گردش پھر شروع ہو جاتی۔ زندگی کیا ہے؟ اس سوال کے نپے تلے جوابات تھے۔ انتظار کا ایک پیہم' پریشان کن احساس' کسی مبہم وعدے کی وجہ سے حال کو نظرانداز کرنے کی حماقت ایک ایسی مسلسل بوریت جو خلاف توقع پیش آنے والے واقعات سے کبھی کبھی ٹوٹتی رہتی ہے۔ جو کبھی کبھی دلچسپ بھی ہو جاتی ہے اور اداسی! اور زندگی کا نہ ہونا؟ ہر مایوسی' ہر تباہی' پریشانی......... سب کچھ موت کے مقابلے میں بہتر ہے......... اور موت؟ وہ ہر چیز کی نفی ہے۔ بشمول زندگی۔ جو بے شمار گزرے ہوئے کل زمین تلے دفن کر دیتی ہے۔

وہ جاننا تھا کہ موت کیا ہوتی ہے......... کیسی ہوتی ہے......... وہ اس کا تصور کرتا رہا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کا جسم پسینے میں نہا رہا ہے۔ خوف کا ذائقہ اسے اپنی زبان پر محسوس ہو رہا تھا۔

جہاز کے ٹیک آف کرنے کے جھٹکے نے اسے چونکا دیا۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ شہر کی روشنیاں دور اور چھوٹی ہوتی جا رہی تھیں۔ فضائی سفر اسے ہمیشہ اداس کر دیتا تھا۔ عام طور پر لوگوں کو سنسنی یا خوف کا احساس ہوتا ہے لیکن اسے لگتا تھا کہ وہ کوئی بہت قیمتی چیز پیچھے چھوڑ آیا ہے' جواب اسے کبھی نہیں ملے گی۔ شاید وقت۔ وہ سوچتا تھا کہ زندگی اس کی ناموجودی کے باوجود اپنے انداز میں بے پروائی سے جاری رہے گی۔

لیکن اس پرواز میں احساس زیاں بے حد شدید تھا۔ کیونکہ زندگی کی ضمانت تو کجا' کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ واپسی کا امکان نہیں تھا۔ وہ زندگی سے دور جارہا تھا اور زندگی کو جاری رہنا تھا۔ اسکول میں اس کی جگہ کوئی اور ٹیچر رکھ لیا جائے گا۔ جمیل الرحمٰن اس سے اسکول کی ملازمت جاری رکھنے پر کس قدر مصر تھے مگر اب انہیں جلد از جلد متبادل ٹیچر کے حصول کی فکر ہوگی۔ ابتدا میں طلباء اسے مس کریں گے مگر جلد ہی اسکول کی چھٹیاں ہوں گی۔ چھٹیاں گزار کر واپس آئیں گے تو وہ اسے بھول چکے ہوں گے۔ وہ متبادل ٹیچر کو قبول کرلیں گے۔

بابر ٹہلتا ہوا آیا اور اس نے شہلا اور نذیر سے سرگوشی میں کچھ کہا پھر وہ کیبن میں چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی نذیر کمال کے پیچھے والی سیٹ پر آبیٹھا اور شہلا نے دونوں لڑکوں کے پیچھے والی سیٹ سنبھال لی۔ نذیر نے کہا "ابھی روشنیاں گل ہونے والی ہیں۔ تم میں سے کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔"

"تمہارا رخ کابل ہی کی طرف ہے نا؟" بابر نے نوید سے پوچھا۔

"خود دیکھ لو۔" کیپٹن نوید نے انسٹرومنٹس کی طرف اشارہ کیا "تم تو اس جہاز کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو۔"

"بہت اسمارٹ بن رہے ہو کیپٹن۔ ابھی ہم پاراچنار سے پیچھے ہی ہیں نا؟"

"میں نے کہا نا' خود دیکھ لو۔ میرے کہنے پر تو تمہیں یقین نہیں آئے گا۔"

بابر نے اس کی طرف کاغذ کا ایک ٹکڑا بڑھایا۔ "یہ ہیں تمہاری نئی ہیڈنگز۔"

نوید نے کاغذ کا جائزہ لیا۔ "جنوب مشرق کی سمت؟"

"ہاں۔"

"مجھے بتادو کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔ تاکہ میں اس کے لئے تیار رہوں۔"

بابر نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو آف کردیا۔ "تم فکر نہ کرو۔ جہاز کے کسی چیز سے ٹکرانے کا کوئی امکان نہیں اور اب تم جہاز کی لائٹس بھی آف کردو۔"

"یہ خطرناک ہوگا۔" کیپٹن نے احتجاج کیا۔

"جیسا میں کہتا ہوں' ویسا ہی کرنا ہے تمہیں۔"

نوید نے تعمیل کی پھر بولا "سنو.......... تم جہاز سے چھلانگ لگانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے؟" اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

"گڈ۔ اگر تم ملک میں کہیں بھی جہاز اتارو گے تو پولیس تمہاری منتظر ہوگی۔"

"ٹھیک کہتے ہو لیکن تم نے ایک امکان پر غور ہی نہیں کیا ہے۔" بابر نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تم نے یہ فرض کرلیا ہے کہ ہم کسی ایئرپورٹ پر اتریں گے۔"

کیپٹن نوید دہل کر رہ گیا۔ "سنو.......... اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں ایئرپورٹ کے علاوہ کہیں یہ جہاز اتاروں گا تو غلطی پر ہو۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

بابر نے پستول نکالا اور اس کی گدی سے لگادیا۔ "میرے خیال میں تمہارا کو پائلٹ زیادہ تعاون کرے گا۔" وہ بولا۔ "اور اس صورت میں مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ریوالور ہٹالو۔ تم نے مجھے تجسس میں مبتلا کردیا ہے۔ میں تمہاری حماقت مس نہیں کرنا چاہوں گا۔" نوید نے جلدی سے کہا۔

"گڈ۔ اب میری ہدایات سنو۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی اس نئی منزل کے لئے تم جہاز کو ہموار انداز میں گھماؤ۔ اب تمہیں ریڈیو کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری آنکھوں کا کام کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اندر سے بھی اور باہر سے بھی لائٹس آف کردی جائیں۔ گڈ.......... تم نے جہاز کو صحیح راہ پر ڈال دیا ہے۔ یہ بہت عمدہ ٹرن تھا۔ اپنی رفتار دو سو ناٹس رکھو۔ اب ۲۵ منٹ تک اس ہیڈنگ کی طرف چلتے رہو۔ بعد کی بات میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ اس دوران اپنے کو پائلٹ سے کہو کہ چوکنا رہے۔ جہاز کو کسی چیز سے ٹکرانا نہیں چاہئے۔" اس نے کو پائلٹ اور نیوی گیٹر کے سروں سے ہیڈ فون اتار لئے۔ اس نے چیک کیا کہ مائیکرو فون بھی ہٹادیئے گئے ہیں یا نہیں۔ "اب ہماری باہر کی دنیا سے بات نہیں ہوگی۔"

اس نے مزید کہا۔ "تم میں سے کسی نے سیٹ سے اٹھنے کی کوشش کی تو مشکور

تمہیں ختم کردے گا۔" وہ لائٹس بجھنے کا انتظار کرتا رہا پھر کیبن سے نکل آیا۔

☆---------------☆---------------☆

کمال کے لئے وہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ اسے جیٹ انجنوں کی دہاڑ سنائی دے رہی تھی اور وہ خود کو آگے کی طرف گرتا محسوس کر رہا تھا لیکن آنکھیں جیسے بینائی سے محروم ہوگئی تھیں۔ اسے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ تاریکی جہاز کے اندر کس مقام پر ختم ہو رہی ہے اور باہر کی بیکراں تاریکی کہاں سے شروع ہو رہی ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کس سیٹ پر بیٹھا ہے' درمیانی راستہ کتنا چوڑا ہے اور فرنٹ سے بیک تک نشستوں کی کتنی قطاریں ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نذیر نے خواہ مخواہ ہی دھمکی دی ہے کہ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ وہ سیٹ سے کیا اٹھتا۔ جب کچھ سجھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا بھی ہوتا تو اسے پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ صوفیہ نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ اچھل پڑا۔ صوفیہ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ کی لرزش سے اس کی اعصابی کشیدگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس خاموشی میں صوفیہ کے دل کی دھڑکن اسے اس کے ہاتھوں میں محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چند منٹ اس کے قرب کی حدت سے محظوظ ہوتا رہا پھر تحفظ کی وہ فضا اچانک ہی درہم برہم ہوگئی۔ اس کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ اسے اپنے قریب کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ کیا تھی' یہ وہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔

پھر ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ "ہیلو کمال رشید' کیا ہو رہا ہے؟" آواز اس کے کان سے بہت قریب تھی۔ "خاصی دیر ہوگئی۔ تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس لئے کہ میں بہت زیادہ مصروف تھا۔" لہجے میں تمسخر تھا "مگر میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے اب بھی تم سے محبت ہے۔ تمہاری بہت فکر ہے مجھے۔"

کمال نے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ "تمہاری حس مزاح ناقابل برداشت ہے بابر۔"

"مجھے خوشی ہے کہ میں تمہیں مزاحیہ کردار لگتا ہوں۔" بابر نے کہا "مجھے امید ہے کہ تم ہنستے ہوئے مرو گے۔"

"اور میں تمہاری دھمکیوں سے تنگ آچکا ہوں۔"

"اوہ.......... میرا خیال ہے' یہ بات اب واضح ہو جانی چاہئے۔ میں دھمکی نہیں دے رہا ہوں' وعدہ کر رہا ہوں تم سے۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اب ایک گھنٹا گزرنے سے پہلے تم مر جاؤ گے۔"

کمال کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ "بابر.......... میرا مشورہ ہے کہ یہ کام صفائی سے کرنا.......... یقینی طور پر۔"

"کمال رشید.......... کیا یہ دھمکی ہے؟"

"نہیں بابر۔ یہ بھی ایک وعدہ ہے۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں تمہیں ضرور ختم کروں گا۔ سا گندی نالی کے کیڑے۔" کمال نے کہا اور اب وہ بابر کے رد عمل کا منتظر تھا لیکن وہاں خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ شاید بابر اس اندھیرے میں کہیں کھسک گیا تھا۔ تاکہ وہ اس کے الفاظ پر غور کرتا اور پریشان ہوتا رہے۔ اپنی موت کا تصور کرے۔ سوچے کہ وہ کس انداز میں قتل کیا جائے گا اور تصور میں خود کو مردہ دیکھے۔

ذہنی طور پر کمال جانتا تھا کہ جہاز کے لینڈ کرتے ہی اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ تصور میں بابر کو دیکھ سکتا تھا کہ وہ اس کے سر سے گن لگا کر ٹریگر دبا رہا ہے۔ اس کے باوجود موت اس کے تصور میں نہیں آئی تھی۔ وہ تصور میں اپنے سر کو اٹھاتے.......... ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے دیکھتا۔ خود کو خون اور بھیجے میں نہایا ہوا دیکھتا۔ اس کے باوجود زندگی سے اس کا تانا نہ ٹوٹتا۔ وہ دنیا سے رخصت نہ ہوتا۔ اس لئے کہ اس نے دنیا میں ابھی کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اسے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ وہ سوچتا' ڈراما ختم ہونے.......... مکمل ہونے سے پہلے صرف چھوٹے موٹے کردار ہی مرتے ہیں۔ ہیرو پر کچھ بھی گزرے' لیکن وہ اپنے عمل سے ڈرامے کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا کر دم لیتا ہے۔ یہ اس کی ذمے داری ہوتی ہے۔ اس سے پہلے ڈائریکٹر اسے مرنے نہیں دیتا۔ وہ بدی کو ختم کردے یا بدی کے ہاتھوں ختم ہو جائے لیکن اس کے اور بدی کے درمیان فائنل ضرور ہوتا ہے۔ ہیرو بے بسی کی موت نہیں مر سکتا۔ ہاتھ پاؤں ہلائے' مقابلہ کئے بغیر وہ بدی کے ہاتھوں ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ نیکی کی.......... ہیروشپ کی توہین ہے۔

اس نے خود کو کبھی ہیرو نہیں سمجھا تھا لیکن بزدل بھی کبھی نہیں سمجھا تھا۔ وہ ہاتھ ہاں چھوڑ کر پوری سپردگی کے ساتھ اس طرح کی موت کو قبول کرنے کا تصور بھی نہیں رسکتا تھا' جہاں اس کی موت بدی کی فتح کی علامت ہو۔ بابر شیطان تھا' اور وہ اس سے رف اتنا مطالبہ کر رہا تھا کہ وہ اس کے ایک اشارے پر مرجائے لیکن یہ تو ٹھیک نہیں۔ ہا ہونے سے روکنے کے لئے اسے کچھ کرنا ہوگا۔ کوئی جوابی منصوبہ بنانا اور بڑے محتاط ااز میں اس پر عمل کرنا ہوگا لیکن کیسا منصوبہ؟ جبکہ وہ وسائل سے پوری طرح محروم ہے۔ وہ کیا کرسکتا ہے؟ وہ سوچتا رہا..........

☆-----------☆-----------☆

کنٹرول ٹاور میں بہت شور ہو رہا تھا۔ باہر نکل کر جلیس نے سکون کی سانس لی۔ ر نصیر کی شخصیت نے اسے اس بار بہت متاثر کیا تھا۔ وہ اپنے کام سے بہت مخلص تھا۔ پر کے احکامات اسے بھی برہم کرتے تھے۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ مجرموں کو کسی قیمت پر ی کامیاب نہ ہونے دے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے مجرموں کو من مانی کی اجازت دینا اس کی ھ سے باہر تھا۔ مجرموں کے کامیابی سے بچ کر نکل جانے کا تصور اس کے لئے سوہان وح تھا لیکن وہ حقیقت پسند بھی تھا۔ صورت حال مخالف ہو تو وہ پیچھے ہٹنے کی اہمیت بھی ھتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ارباب اختیار کا حکم ماننے میں ہی بہتری ہے۔ بے سبب خود کیوں الزام لیا جائے۔ ذمہ داری فیصلہ کرنے والوں پر ہی کیوں نہ چھوڑی جائے۔

جلیس سوچ رہا تھا کہ کاش وہ بھی اس جیسا ہوتا تو اس وقت اتنا بے سکون نہ ہوتا۔ ینے میں درد کا پیوست نیزہ لئے یوں نہ پھر رہا ہوتا۔ یوں مطعون نہ ہوتا لیکن یہ کہاں ن تھا۔ پولیس آفیسر ہونے کا اپنا ایک پریشر ہے۔ پولیس کے محکمے کو اتنا خراب سمجھا جاتا ہے.......... اتنا غیر مستعد' غیر ذمے دار کہ اچھے آدمی.......... اچھے پولیس آفیسر پر اس اثر کو زائل کرنے کا اضافی دباؤ بھی ہوتا ہے۔

ایئرپورٹ کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے وہ دونوں کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے اپنی اپنی وچوں میں گم تھے۔

میجر نصیر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "سنو.......... کچھ کھایا بھی ہے تم نے؟ سینڈوچ

منگوالو؟"

جلیس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں میں کچھ نہیں کھا سکتا۔ میرا تو ویسے ہی جی متلا رہا ہے۔"

میجر نے جیب سے ایک ٹیبلٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ "یہ پانی سے لے لو۔ ویسے سب سے زیادہ تمہیں نیند کی ضرورت ہے۔"

"ہاں' نیند کی اور ڈھنگ سے کھانا کھانے کی۔" جلیس نے ٹیبلٹ حلق سے اتارنے کے بعد کہا۔ "اور شاید ڈاکٹر کی۔ میرے سینے میں شدید درد ہے۔ بابر نے مجھ پر گولیاں چلائیں تھیں۔ میں نے بچنے کے لئے جو چھلانگ لگائی تو سینے کی کوئی مسل کھنچ گئی ہے۔"

"درد کس طرح ہے۔"

"بائیں جانب۔"

"یہ تشویش ناک بات ہے۔ خاص طور پر متلی کے ساتھ۔ تمہیں فوراً ڈاکٹر کو دکھانا چاہئے۔"

جلیس نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ بابر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ شخص کہاں جائے گا۔ کابل؟ یا کہیں اور۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ خاص طور پر دہشت گردوں کے لئے۔ وہ کہیں بھی جاسکتا ہے۔ تمام ممکنہ ایئرپورٹس کو خبردار کردیا گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جو کچھ بھی ہوگا' اس کی ذمہ داری ہوگی۔ اسے مری میں ہی ان پر قابو پالینا چاہئے تھا۔ وہ اچھا پولیس آفیسر ثابت نہیں ہوا۔ اسے باہر کا خیال ابتداء ہی میں کرنا چاہئے تھا۔ یہ غیر منطقی نہیں تھا کہ مجرموں نے اپنے کسی ساتھی کو کسی ایسی بلڈنگ میں چھوڑا ہو' جہاں سے اسکول پر نظر رکھی جاسکے۔ یہ بات اس نے ابتدا میں ہی سوچ لی ہوتی اور لڑکی کو گرفتار کر لیا ہوتا تو اس کی کارروائی کبھی ناکام نہ ہوتی اور مجرم ناکام ہوچکے ہوتے۔ اگر وہ لڑکی..........

لڑکی کا خیال آتے ہی اس کے سینے میں درد کی ایک لہر اٹھی۔ اس نے سوچا' اسے یہاں آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ وہیں رکنا چاہئے تھا۔ لڑکی سے معلومات حاصل ہوجاتیں تو

مجرموں کی منزل کے متعلق معلوم ہوجاتا پھر انہیں بے خبری میں چھاپا جاسکتا تھا۔

جلیس میجر سے لڑکی کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن اسے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کی باتوں میں کہیں اس کا احساس جرم نہ جھلک جائے۔ وہ یہ اعتراف کسی اور کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے لڑکی سے معلومات حاصل کرنا اس کے لئے اہم ہوگیا تھا۔

اسی وقت ایک جوان میجر نصیر کے پاس چلا آیا۔ "سر.......... آپ کنٹرول روم میں چلیں۔ گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

میجر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا "ایکسکیوزمی" اس نے کہا۔

میجر نصیر کو پہلے ہی ڈر تھا کہ یہ کام آسان ثابت نہیں ہوگا۔ بابر بہت خبیث اور ذہین مجرم تھا۔ اس نے مکمل تیاریوں کے ساتھ مکمل ترین منصوبہ بنایا تھا اور شاید وہ ان تمام ٹیکنیکس سے واقف تھا' جو دنیا بھر میں دہشت گردوں سے نمٹنے کے لئے آزمائی جاتی ہیں۔ اس نے تنبیہہ کردی تھی کہ اس کے تعاقب میں کوئی طیارہ نہ آئے۔ میجر نے اس کا توڑ یہ کیا تھا کہ تعاقب کرنے والے ایئرفورس کے جیٹ طیارے کو تاخیر سے پرواز کرنے کی ہدایت دی تھی۔ اب اسے احساس ہورہا تھا کہ یہ اس کی غلطی تھی۔ اسے تعاقب کرنے والے طیارے کو پہلے ہی فضا میں پہنچا دینا چاہئے تھا۔

ریڈار اسکوپ پر ایک نظر ڈالتے ہی اسے احساس ہوگیا کہ اس کا خدشہ درست ہے۔

"انہوں نے سمت کب تبدیل کی؟" اس نے پوچھا۔

"ہمیں نہیں معلوم سر۔ وہ صرف دو منٹ ریڈار پر نظر آئے۔ ہم نے ہر جگہ رابطہ کرلیا ہے۔ وہ کہیں' کسی ریڈار پر نمودار نہیں ہوئے ہیں۔"

"پائلٹ سے تمہارا رابطہ نہیں ہے؟"

"میں نے بہت کوشش کی ہے سر لیکن انہوں نے ریڈیو بند کردیا ہے شاید۔"

"اور جیٹ طیارے کی کیا رپورٹ ہے؟"

"وہ ۷۳۷ تک پہنچ ہی نہیں سکا جناب۔"

میجر نصیر نیچے چلا آیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ مجرم ان کے ہاتھ

سے نکل گئے ہیں۔ پیراشوٹ طلب کرنے کو اس نے بلف سمجھا تھا۔ اس کے خیال میں بوئنگ ۷۳۷ ایسا جہاز نہیں تھا' جس میں سے آسانی سے چھلانگ لگائی جاسکے اور اس کا خیال تھا کہ بابر اتنا پاگل نہیں کہ ایسی کوئی کوشش کرے گا۔ پیراشوٹ صرف انہیں دھوکا دینے کے لئے تھے لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔ وہ لوگ کہیں بھی چھلانگ لگادیں گے اور وہ ان کے متعلق جانتے کچھ بھی نہیں تھے۔ صرف نام انہیں معلوم تھے اور ناموں سے مجرموں کی شناخت ممکن نہیں تھی پھر بھی اس سلسلے میں تمام بڑے شہروں کی پولیس سے رابطہ کرلیا گیا تھا۔

میجر نصیر کو اس وقت خود پر زبردست غصہ آرہا تھا۔

☆============☆============☆

بابر نے کیپٹن نوید کے پیچھے کھڑے ہوکر جھکتے ہوئے انسٹرومنٹس کو چیک کیا۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے کہا۔ "تم شاندار کام کررہے ہو کیپٹن۔ اب تم جہاز کو گھماتے ہوئے بتدریج نیچے کی طرف لاؤ گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تم دو ہزار فٹ کی بلندی پر ڈیڑھ سو ناٹ کی رفتار سے چلو۔" یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کی طرف ایک اور کاغذ بڑھایا۔

کیپٹن نوید انسٹرومنٹس کی ہلکی روشنی میں کاغذ کو گھورتا رہا پھر بولا "دوبارہ رخ تبدیل کریں..........؟"

"ہاں۔"

"لیکن جہاز کو اتنی کم بلندی پر اڑانا اور اتنی کم رفتار پر.......... یہ مناسب نہیں۔ خاص طور پر اس لئے کہ مجھے نہیں معلوم کہ کہاں ہوں اور باہر کیا کچھ ہے۔"

"میری ہدایات پر عمل کرتے رہو تو کسی چیز سے نہیں ٹکراؤ گے۔" بابر نے کہا "تمہیں مجھ پر اعتبار اور انحصار کرنا ہوگا۔"

"تم پر اعتبار! تم پر انحصار! میں تمہیں اس قابل نہیں سمجھتا۔" کیپٹن نوید کا پیمانہ صبر لبریز ہونے لگا۔ اس شخص کے ساتھ تحمل ناممکن تھا' وہ تو اس کی تربیت کو بھی تباہ کئے دے رہا تھا۔

"میں اب تمہیں پسند کرنے لگا ہوں کیپٹن۔" بابر نے بڑے خلوص سے کہا۔

"لیکن یہ پسندیدگی دو طرفہ نہیں ہے۔"

"تم اچھے بچوں کی طرح کہنا مانتے رہو تو ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو میں کوئی اہمیت نہیں دوں گا۔"

نوید نے جہاز کا رخ موڑا اور بلندی کم کرتے ہوئے نئی ہیڈنگ کی طرف بڑھنے لگا۔ رفتار کم کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔ "کیا واقعی تم چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"تمہارے لہجے سے لگتا ہے کہ تمہارے خیال میں ہم ایسا نہیں کرسکتے!" بابر کے لہجے میں کھلنڈرا پن تھا۔

نوید سے اس کا لہجہ برداشت نہ ہوسکا۔ "کاش.......... میں یہ منظر دیکھ سکوں۔ بعد کا حال تو مجھے معلوم ہے۔ تمہارے وجود کو زمین سے سمیٹنے میں ہفتوں لگیں گے۔

"یقین سے کہہ رہے ہو یہ بات؟"

"میں جانتا ہوں کہ اس جہاز کی رفتار اتنی کم نہیں کرسکتا کہ تم محفوظ طریقے سے چھلانگ لگا سکو۔ اس کام کے لئے جہاز کی رفتار اتنی کم ہونی چاہئے کہ وہ جہاز کے فضا میں لٹک جانے کے برابر ہو اور یہ ناممکن ہے۔"

"یہ حساب میں بھی لگا چکا ہوں۔ اس لئے میرا جمپ لگانے کا کوئی ارادہ نہیں۔" بابر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نوید نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ "تو پھر تمہارے ارادے کیا ہیں؟"

"لینڈنگ۔"

"لینڈنگ! یہاں؟"

"ہاں.......... بالکل یہیں۔ اسی جگہ۔"

"اب مجھے یقین ہوگیا کہ تم پاگل ہو۔"

☆------------☆------------☆

میجر نصیر کنٹرول ٹاور میں ٹہل رہا تھا۔ وہ پریشان تھا۔ آدھا گھنٹا ہوچکا تھا۔ دہشت گردوں کے جہاز کے متعلق کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ جہاز کو کہیں کسی ریڈار پر

نہیں دیکھا گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ موسم تھا۔ آسمان پر بادل بہت زیادہ تھے اور شاید جہاز کو بہت بلندی پر اڑایا جارہا تھا۔ آخری پوزیشن کے مطابق جہاز کا رخ کابل کی طرف تھا مگر اس کے بعد سے اب تک کچھ بھی معلوم نہیں ہوسکا تھا۔

اب میجر نصیر کو یہ ڈر تھا کہ کہیں جہاز کسی حادثے کا شکار نہ ہوگیا ہو۔ اس وقت فضائیہ کے کئی جہاز گمشدہ جہاز کی تلاش میں اردگرد کے علاقے کو کھنگال رہے تھے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ بابر نے جہاز کسی صحرا میں اتروالیا ہو۔ اس صورت میں صبح ہونے سے پہلے اس کا پتا چلانا ناممکن تھا۔ اس صورت میں بابر کو ان پر.......... کم از کم آٹھ گھنٹے کی سبقت حاصل ہو جاتی اور آٹھ گھنٹے میں تو پورا گروپ یوں غائب ہو تا کہ سراغ بھی نہ ملتا۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے جلیس کے پاس رک گیا۔ "اب مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔" اس نے کہا "تم اسپتال سے چیک تو کرو۔ اس لڑکی کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے۔ اب ہمارے پاس وہی ایک کلیو رہ گیا ہے۔"

جلیس کا درد ویسے کا ویسا ہی تھا۔ وہ کسی مریض کی مانند تھا' جسے نیند آتی ہو لیکن پوری طرح نہ سوپاتا ہو۔ کچی نیند میں ہی معمولی سی آہٹ پر بھی جاگ جاتا ہو۔ اس وقت میجر نصیر کے لفظوں نے اور مجرموں کی ساتھی لڑکی کی یاد نے اسے پھر جگادیا۔ "میں ابھی فون کرکے پوچھتا ہوں۔" اس نے کہا اور برابر والے کمرے کی طرف بڑھ گیا' جس میں فون تھا۔

میجر نصیر پھر مضطربانہ انداز میں ٹہلنے لگا۔ لڑکی واقعی اب بہت زیادہ اہمیت اختیار کرگئی تھی۔ وہ بتاسکتی تھی کہ مجرموں کا منصوبہ کیا ہے۔ اگر وہ لینڈ کرچکے ہیں تو لڑکی سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں وہ تیزی سے جہاز تک پہنچنے کی کوشش کرسکتے تھے۔ وہ یرغمالیوں کو بچانے اور دہشت گردوں کو پکڑنے کی کوشش کرسکتے تھے۔

اس نے رک کر ریڈیو کی طرف دیکھا۔ یہ ایک اور مصیبت تھی۔ وزیرداخلہ اب تک متعدد بار اسے مخاطب کرچکے تھے۔ ان کی پریشانی قومی بھی تھی اور ذاتی بھی لیکن ان کی کال ہر بار اس پر موجود دباؤ میں اضافہ کردیتی تھی۔ وہ جہاز کے اوجھل ہوجانے کو اس

کی غیر ذمے داری سمجھ رہے تھے۔ اگرچہ انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ انہیں بتا چکا تھا کہ اس کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔ دہشت گردوں نے منصوبہ بناتے ہوئے آخر تک تمام جزئیات کا خیال رکھا تھا اور پھر قسمت بھی ان کا ساتھ دے رہی تھی۔

وہ فون روم کی طرف بڑھا تاکہ جلیس سے صورت حال معلوم کرے لیکن کمرے میں جو کچھ نظر آیا' وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ جلیس دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ نصیر کو دیکھ کر وہ لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف بڑھا مگر درمیان میں ہی اس کے جسم کو تشنج کا جھٹکا لگا اور وہ دہرا ہو گیا۔ نصیر نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ جلیس نے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ اسی لمحے اسے دوسرا جھٹکا لگا اور وہ نصیر کے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر گرتا چلا گیا۔ نصیر اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

لفظ جلیس کے ہونٹوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے۔ "وہ.......... آپریشن.......... کے.......... دوران.......... مر گئی.........." پھر وہ ایک طرف لڑھک گیا۔

میجر نصیر نے اسے سیدھا کیا' اس کے سینے پر ہاتھ رکھا' نبض ٹٹولی لیکن کہیں کچھ نہیں تھا۔ سانسوں کی ڈور ٹوٹ چکی تھی۔

میجر نصیر کئی لمحے ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ایس پی جلیس احمد کی پوسٹ مارٹم رپورٹ یہی بتاتی کہ اس کی موت فطری ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ بابر کے ہاتھوں مرنے والوں کی تعداد چھ ہو گئی ہے۔ جلیس اس دباؤ کے ہاتھوں ختم ہوا تھا' جو بابر کے بہیمانہ جرم کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔

میجر کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ "بابر!" وہ غرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

☆===========☆===========☆

کیپٹن نوید نے جہاز کی نوز کے پار زمین کو محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس کے انسٹرومنٹس بھی اسے کچھ نہیں بتا رہے تھے۔ روشنی نہ ہونے سے اسے الجھن ہو رہی تھی۔ ونگ لائٹس کی کمی اسے شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

وہ ہوتی تو کم از کم اسے فلائنگ لیول کا اندازہ تو ہوتا۔ وہ بابر پر انحصار نہیں کر سکتا تھا۔ ممکن ہے' وہ کوئی جینئس ہو لیکن وہ ہوا باز تو نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک خطرناک مجرم.......... دہشت گرد تھا۔ ایسے لوگوں کے ذہن پر اور ذہن کی کارکردگی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ایسے مجرم بہرحال کسی نہ کسی حد تک نفسیاتی مریض ہوتے ہیں اور بابر تو اسے اچھا خاصا پاگل لگ رہا تھا۔ مشکور اسے ٹھیک ٹھاک لگا تھا لیکن بابر کو اس نے پہلی ہی نظر میں ناپسند کیا تھا۔

اور اب.......... وہ ایک نامانوس جہاز خطرناک حد تک کم بلندی پر اڑا رہا تھا اور اسے نہیں معلوم تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ اب اسے کہا جا رہا تھا کہ اس مہیب اندھیرے میں جہاز لینڈ کرے اور وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ یہ نہ جانتا ہو کہ جہاز لینڈ کرنے کو کہا جا رہا ہے وہ کوئی ایسی جگہ ہے' جو جہاز اتارنے کے لئے نہیں بنائی گئی ہے۔ کیونکہ یہ شخص بابر کتنا ہی چالاک سہی لیکن یہ تو ممکن نہیں کہ اس نے کسی صحرا میں لینڈنگ کے لئے کوئی پٹی بنا دی ہو۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ احمق اس سے کسی پرانی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر جہاز اتارنے کی فرمائش کرے گا۔ اس نے کوپائلٹ سے کہا۔ "یہ بابر وہاں مظلوم لوگوں کو ذلیل اور خوف زدہ کرنے کے بجائے یہاں آ کر ہمیں بتاتا کیوں نہیں کہ اب کیا کرنا ہے۔"

کوپائلٹ منیر نے کہا "مجھے جب بتایا گیا کہ اس فلائٹ کے پائلٹ آپ ہوں گے تو میں نے فوراً یہ ذمے داری قبول کر لی مگر اب میں سوچ رہا ہوں کہ نیچے کیا ہے' یہ نہ آپ جانتے ہیں نہ میں جانتا ہوں۔ اس جہاز کو اتارنے کے لئے تو کسی سپرمین کی ضرورت ہے۔"

"سپرمین کو اتنی فرصت کہاں۔"

"ایک بات بتائیں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ اس وقت ہم کہاں ہیں۔"

نوید چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "میرا خیال ہے بالائی پنجاب میں کہیں ہیں۔"

"یعنی ہمیں اترنے کے لئے کوئی انٹرنیشنل ایئرپورٹ نہیں ملے گا۔"

"میری پریشانی اس سے کہیں سوا ہے۔"

دونوں آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں کسی ممکنہ خطرے کو ٹٹولتے اور باتیں کرتے رہے۔ "ایک بات اور بتائیں کیپٹن۔" منیر نے کہا "اگر کسی ائرفیلڈ سے ہٹ کر کہیں جہاز لینڈ کرنا پڑا تو آپ کر سکیں گے؟"

نوید مسکرا دیا۔ "مجھ پر جو تم اعتماد کا اظہار کر رہے تھے' وہ کیا ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ میں جہاز کو لینڈ کر سکوں گا لیکن پہلے ہم اس مقام تک پہنچیں تو۔ پھر اس کی فکر کریں گے۔ اگر زمین ناہموار ہوئی اور ایک آدھ وہیل ٹوٹ گیا تو بڑی خطرناک لینڈنگ ہوگی اور میرے بھائی' ٹینکیاں فل ہونے کی وجہ سے مسئلہ سنگین ہو جائے گا۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔"

"دعا کرو کہ وہ مردود بابر بھی اس سلسلے میں سوچ لے۔"

"کسی نے مجھے یاد کیا؟" وہ بابر کی آواز تھی۔ وہ اسی لمحے کیبن میں داخل ہوا تھا۔

"یہ جوتے تمہارے زبردست ہیں۔ ساؤنڈ پروف۔" نوید نے کہا۔ "انہیں پیٹنٹ کرا لو۔"

"تم اچھے خاص مسخرے ہو کیپٹن۔ جتنے زبان دراز ہو' اتنے ہی اچھے ہواباز بھی ہو تو بہتر ہے۔"

"ہواباز میں زیادہ اچھا ہوں۔"

"گڈ۔ اب آزمائش کا وقت بھی آپہنچا ہے۔ میری تجویز ہے کہ اب تم پہیئے کھول دو اور جہاز کی رفتار کم سے کم کر دو۔ رن وے بہت تنگ ہے۔"

"کیسا رن وے؟" نوید نے چڑچڑے پن سے پوچھا۔

"کھڑکی سے باہر دیکھو تو تمہیں اپنا رن وے نظر آ جائے گا۔"

کیپٹن نوید نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ہلکی روشنی میں اسے دو متوازی سیاہ لکیریں سی نظر آئیں۔ پٹی واقعی بہت تنگ تھی اور مختصر بھی۔ اس پر جہاز اتارنا بہت دشوار کام تھا۔ "اس سے تو اچھا تھا کہ تم مجھ سے ماچس کی ڈبیا پر لینڈنگ کی فرمائش کرتے۔"

"یہ ماچس کی ڈبیا نہیں ہے کیپٹن لیکن تمہارے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"اگر یہ ٹھوس رن وے نہیں ہے تو جہاز اسے کھود ڈالے گا اور دھنس جائے گا۔" نوید نے کہا۔ اس نے جہاز کے پہیئے کھول دیئے تھے اور اب رفتار کم کر رہا تھا۔

"مجھے داد دینی پڑے گی تمہیں۔" بابر نے مربیانہ انداز میں کہا "میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا ہے۔ کتنا خوبصورت رن وے ہے۔ یہ جانتے بھی ہو' یہ کیا ہے؟"

"تم ہی بتا دو۔" کیپٹن نوید نے بے زاری سے کہا۔

"یہ تمہارا چھ لین کا موٹروے ہے جو اب سکڑ کر چار لین کا رہ گیا ہے۔" بابر نے انکشاف کیا۔ "ان چھوا......... کنوارا موٹروے' جو ابھی تک استعمال نہیں ہوا ہے۔ پچھلی بار جب میں یہاں آیا تھا' اس کے مقابلے میں اب یہ سو فٹ بڑھ گیا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے ہاں سڑکیں کتنی سست رفتاری سے بنتی ہیں۔ اب تو غیر ملکی مستعد کمپنیوں کو بھی سست رفتاری پر مجبور کر دیا گیا ہے۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔" نوید کا دماغ گھوم گیا۔

"غور سے سنو۔ میں تمہیں تمہارے کام کے بارے میں لیکچر نہیں دینا چاہتا۔" بابر نے بے پروائی سے کہا "لیکن ایک مشورہ سن لو۔ یہ جو دو روشنیاں نظر آ رہی ہیں' تمہیں جہاز کو ان کے عین درمیان لینڈ کرنا ہے۔ ذرا سی غلطی کرو گے تو جہاز سڑک بنانے والے آلات سے ٹکرائے گا' جو ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں اور اگر نسبتاً آگے لینڈ کیا تو لینڈنگ کی پٹی چھوٹی پڑ جائے گی۔ ٹھیک لینڈنگ کی صورت میں بھی انجن ریورس کر کے بریک پر کھڑے ہو جانے میں عافیت ہوگی۔ رن وے چھوٹا پڑ سکتا ہے۔"

"اس کی چوڑائی کتنی ہے؟"

"میں پورا حساب لگا چکا ہوں۔ پہیوں کے دونوں طرف دو فٹ فاضل سڑک ہوگی۔"

کیپٹن نوید کو غصہ آ گیا۔ "خواہ مخواہ چار فٹ سڑک ضائع کر دی تم نے۔ ارے......... دونوں طرف دو دو فٹ فاضل سڑک کی کیا ضرورت تھی۔ بڑے ایکسپرٹ بنتے ہو۔ نہیں جانتے کہ بریک لگانے سے پہلے جہاز تین چار فٹ ادھر ادھر ضرور ڈولتا ہے۔"

اور میرے لئے تو یہ جہاز بھی نیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بریک کیسے ہیں۔"

"یہ تمہارا دردسر ہے کیپٹن اور ہاں.......... سڑک زمین کے مقابلے میں تین فٹ بلند ہے۔"

نوید زیر لب بڑبڑایا۔ پھر بولا "اب تو جہاز کو سڑک پر رکھنا اور ضروری ہو گیا ہے اور مسٹر بابر' اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ سڑک جہاز کو جھیل جائے گی۔ پھٹ نہیں جائے گی۔ مجھے تو یقین نہیں آسکتا.........."

"یہ سڑک پاکستانی نہیں' کوریا والے بنا رہے ہیں۔" بابر نے کہا "میں نے اس کے انجینئر سے بات کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ روڈ جہاز جتنے وزن کو جھیل سکتی ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں نے اس سے جہاز کا پوچھا تھا۔ میں نے بس وزن تجویز کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ اتنے دباؤ پر روڈ کی کیا کیفیت ہو گی۔ اس نے کہا کہ سڑک بس کہیں کہیں سے معمولی سی چیخ سکتی ہے ایسی کہ اس کی مرمت میں زیادہ دیر بھی نہیں لگے گی.........."

"یہ غلط ثابت ہوا تو وہ ہم سب کو سڑک کے ساتھ ڈھلوادیں گے اور کنارے پر بورڈ لگادیں گے اس سڑک کو کرش ٹیسٹ کرلیا گیا ہے۔" نوید نے چڑ کر کہا۔

"میرا خیال ہے' اب تم زبان کی تیزی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے لینڈنگ کی فکر کرو۔"

☆-----------☆-----------☆

کمال نے پہیے کھلنے کی آواز سنی تو چونک گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جہاز کی رفتار کم ہو رہی ہے۔ اس کا جسم تن گیا۔ کاش.......... جہاز اڑتا ہی رہے۔ اس نے سوچا۔ یہ خیال بہت آہستگی سے ابتداء میں اور پھر تیزی سے اس کے ذہن میں در آیا کہ اب زندگی کا آخری باب لکھا جانے والا ہے اور اس کی سانسیں بس گنی چنی رہ گئی ہیں۔ اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ کاش وہ یہاں سے اڑ کر اپنے کلاس روم میں پہنچ جائے۔ مختلف موضوعات پر اپنے طلباء سے تبادلہ خیال کرے۔ فیکلٹی روم میں بیٹھ کر پی ٹی آئی مظفر خان کے ساتھ کافی اور سگریٹ پئے۔ زندگی اتنی خوبصورت ہے۔ کون اسے چھوڑنا چاہے گا۔ وہ دھوپ کو اپنے جسم پر اور صبح کی شبنم کو اپنے پیروں تلے محسوس

کرنا چاہتا تھا۔

اس کے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ احساسات جنہیں اس نے اب تک دبائے رکھا تھا اس لئے کہ وہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر بے بسی سے موت کی آغوش میں نہیں اترنا چاہتا تھا اور اس لئے کہ زندگی بڑی پیاری' بڑی خوبصورت چیز تھی لیکن اب موت کو بہت قریب جان کر وہ سب ابھر آئے تھے۔

بابر نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا "کمال رشید.......... بس تھوڑی دیر اور.........."

"کمال نے صرف ایک لفظ کہا اور بڑی شدت سے کہا۔ "نہیں۔"

بابر رکا' اس کی طرف واپس آیا اور حیرت سے کہا۔ "کیا!"

کمال اب پرسکون تھا۔ اس کے اندر بھی وہ اعتماد تھا جو اس کے لفظوں میں جھلک رہا تھا۔ "میں نے نہ مرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں تمہیں روکوں گا۔"

"اتنے کڑے وقت میں یہ حس مزاح حیرت انگیز ہے۔" بابر نے کہا پھر وہ پلٹ کر چل دیا۔

کمال نے اپنے اندر لاوے کی طرح کھولتے ہوئے غصے کو دبایا۔ غصے کو اور اس کے ساتھ ایک توانا لیکن غیر منطقی خوف کو بھی۔ اس نے صورت حال کا حقیقت پسندانہ انداز میں تجزیہ کرنا شروع کیا۔ یہ بات طے تھی کہ وہ چاروں مرجائیں گے لیکن انصاف کا تقاضہ تھا کہ وہ زندہ رہیں اور بابر اور اس کے ساتھیوں کو قرار واقعی سزا ملے۔ ٹی وی کے ڈراموں میں تو یہی ہوتا ہے۔ آخری فتح حق کی ہوتی ہے۔ باطل کچلا جاتا ہے لیکن وہاں تو سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کہیں سے کسی امداد کے ملنے کا امکان نہیں تھا۔ صوفیہ بہت دیر پہلے کوما سے ملتی جلتی کیفیت میں تھی۔ ایک اعتبار سے یہ بہتر ہی تھا۔ اگر وہ سب ایسی ہی بے حسی اور بے خبری کی محفوظ باہوں میں سما جائیں تو موت کا خطرہ بے معنی ہو جائے گا۔ سارا عذاب تو بس سوچنے کا ہے موت کی اذیت تو موت کے خوف کی طوالت میں ہے' اس سے نجات پالی جائے تو کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ ابھی وہ موت کی حدود میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ موت بس ان کے ذہنوں میں ایک مبہم خطرے کی طرح

تھی۔ اب جو اس سے بے نیاز تھا' وہ فائدے میں تھا اور جو تصور میں اس کی جزئیات سے بھرپور شبیہہ تخلیق کررہا تھا' وہ عذاب میں تھا۔

اسے ان لوگوں پر غصہ آنے لگا' جن کی ذمہ داری تھی کہ انہیں آزاد کرائیں اور مجرموں کو کیفرکردار تک پہنچائیں۔ کہاں ہیں وہ لوگ؟ آتے کیوں نہیں غیرذمے دار کہیں کے۔ کیا شیطنت کے پجاری بابر نے انہیں اس طرح انگلیوں پر نچایا ہے کہ ان کے دماغ بیکار ہوگئے ہیں۔ ذہانت جواب دے گئی ہے؟ کیا وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس بگڑے ہوئے معاشرے میں اب برا آدمی نیکی پر غالب آنے لگا ہے' فتح یاب ہونے لگا ہے! جرم کا درخت پھولوں اور پھلوں سے لد جاتا ہے۔ دنیا اب ایک جنگل ہے' جہاں صرف طاقت کا قانون چلتا ہے۔ بابر کے رویے سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ بدی کے کردار میں خوش ہے.......... اور وہ اس کے.......... کمال رشید کے کردار سے بھی خوش ہے کہ اسے کچل کر وہ اپنی برتری اپنی چالاکی' ثابت کرسکے گا۔ نیکی کے کردار کو کچل کر! درست..........

کیونکہ اس ڈرامے میں دو ہی کردار ہیں۔ فعال کردار.......... صوفیہ کو تو شاک نے اس حد تک بے حال کردیا ہے کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتی۔ مشکور اور نذیر دولت کے پجاری اور دہشت گرد کے کھلونے ہیں۔ انہیں صورت حال کا شعوری ادراک نہیں ہے۔ ان دو معصوم لڑکوں کی طرح' جو بس یہ توقع کررہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس ابتلا سے ان کی جان چھوٹ جائے گی۔ باقی کون بچا؟ بس وہ دونوں.......... کمال اور بابر۔ وہ ہی سمجھ سکتے تھے کہ یہ ذہن کی طاقت اور قوت ارادی کی سربلندی کا کھیل ہے۔ جب تک اس معاملے میں دوسرے کو شکست نہیں دی جائے گی۔ بازی نہیں جیتی جاسکتی۔ سو وہ دونوں شطرنج کی بساط پر انسانی جانوں کے مہرے رکھ کر بازی کھیل رہے تھے۔

صوفیہ اور دونوں لڑکوں کو موت کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ لیکن کمال جانتا تھا۔ اسے بابر دھکیلتے دھکیلتے زندگی کے پہاڑ کی اس کگر تک لے گیا تھا' جس سے ایک پل کے فاصلے پر موت کی مہیب کھائی تھی۔ وہ دیر سے اس کگر پر کھڑا تھا اور بابر اسے اس کے پیروں اور کھائی کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ صوفیہ' مظفر اور رئیس نے موت کے بارے میں سوچا بھی ہوگا تو یوں جیسے کوئی فنتاسی۔ انہوں نے اس کے خدوخال تو نہیں

دیکھے تھے۔

اس ڈرامے کا حاصل کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں! یہی اس ہسٹریائی ڈرامے کا سب سے مضحکہ خیز پہلو تھا۔ بابر ان سب کے ساتھ ایک ایسا کھیل کھیل رہا تھا' جس سے آخر میں صرف اتنا ثابت ہوتا کہ وہ اس ڈرامے کے تمام کرداروں سے شیطنت کے معاملے میں بہت آگے تھا۔ سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اس معاملے میں کسی نے اسے چیلنج بھی نہیں کیا تھا۔ یہ ٹائٹل تو وہ بلامقابلہ جیت سکتا تھا۔ یہ بات تو خود کمال بھی بروقت تسلیم کرنے کو تیار تھا لیکن بابر اسے عملی طور پر ثابت کرنا چاہتا تھا۔ وہ اذیتیں دے کر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ شیطنت سب سے بڑی طاقت ہے۔ یہاں اسے چیلنج کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا تھا۔ یہ تواللہ کے سامنے غداری ہوتی۔ بابر اپنی فیصلہ کن فتح کے نشے میں سرشار تھا۔ یہ خیال اسے آیا بھی نہیں ہوگا کہ کہانیوں' داستانوں کی طرح ہیرو غیرمعمولی طاقت کا مظاہرکرکے بساط پلٹ بھی سکتا ہے۔ دشواری یہ تھی کہ حقیقت میں ایسا بہت بڑے لوگوں نے کرکے دکھایا تھا۔ ورنہ عام طور پر یہ قصے کہانی کی باتیں تھیں۔

کمال کو اپنی ہذیانی اور بے ترتیب سوچوں پر خود ہنسی آنے لگی لیکن یہ سچ تھا کہ وہ ایسا ہی کچھ کرنا چاہتا تھا۔ یوں مرجانا تو بہت آسان تھا مگر موت کو اٹل حقیقت جان کر بہت کچھ کیا جاسکتا تھا۔ کم ازکم کوشش تو کی ہی جاسکتی تھی مگر کچھ کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کی ایک سوچ تھی۔ وہ موت سے پہلے مرجانے کو اپنے ہاتھ دوسروں کے خون سے آلودہ کرکے زندہ رہنے سے بہتر سمجھتا تھا مگر اب اسے اس سوچ کو رد کرنا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اسے زندگی زیادہ عزیز تھی بلکہ اس لئے کہ یہ سوچ تھی ہی غلط۔ بدی اور نیکی کی جنگ میں نیکی کو ہتھیار اٹھانے ہوتے ہیں۔ بدی کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ جہاد ہے۔ زندہ تو غازی' مرے تو شہید۔ انسانی خون بہانا بے شک بری بات ہے لیکن انسان اگر شیطان کا آلہ کار بن جائے تو اس کا خون بہانا ہراچھے انسان پر فرض ہے۔

پہلی بار اسے تقویت کا احساس ہوا۔ روح کو توانائی مل جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس بدصورت اور مکروہ شخص کو' جو انسان کے روپ میں شیطان ہے' صفحہ ہستی سے مٹانا ضروری ہے۔

☆------------☆------------☆

کیپٹن نوید نے ہاتھ کی پشت سے پیشانی کا پسینہ پونچھا پھر اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور جہاز کے کنٹرول تھام لئے۔ اسے کنٹرولز میں ارتعاش محسوس ہوا۔ درحقیقت پورے جہاز میں جیسے زلزلہ سا آیا ہوا تھا۔ اس نے جہاز کی ہوا میں اسپیڈ کی کمی کے سدباب اور اسے زمین پر گرنے سے بچانے کے لئے مزید پاور دی۔ وہ بہت آہستگی سے اور بتدریج جہاز کو نیچے اتار رہا تھا۔ جہاز ایک ایک انچ فاصلہ طے کرنے کے لئے زور لگاتا محسوس ہو رہا تھا۔ ہوا میں رہنے کی جدوجہد میں جہاز کا ہر حصہ بج رہا تھا۔ اس کا اپنا جسم تنا ہوا تھا۔ جبڑے اس نے بھینچ لئے تھے۔ جیسے وہ جہاز کو دو روشنیوں کے عین درمیان اتارنے کی جسمانی کوشش کر رہا ہے اور اتارنا بھی بے حد آہستگی سے تھا۔

اس کی آنکھیں دونوں روشنیوں کی درمیانی پٹی پر زور دیتے دیتے تھک گئیں۔ وہ اس کے مرکز کے بارے میں درست ترین اندازہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ دونوں طرف کے پہیوں میں سے کسی کے بھی باہر جانے کا خطرہ نہ رہے۔

بہت نیچے پہنچ کر اس کی نظر سڑک تعمیر کرنے والے آلات کے انبار پر پڑی تھی اس پر خوف طاری ہو گیا۔ جہاز ان کے بالکل برابر سے گزرا تھا۔ اس نے جہاز کو مزید پاور دی اور فلیپ اٹھاتے ہوئے جہاز کو بڑے ہموار انداز میں روشنیوں کے عین درمیان اتار لیا پھر اس نے بڑی پھرتی اور قوت سے تھروٹل کو اپنی طرف کھینچا۔ اس کا جسم سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکرایا۔ اس نے بریک لگائے۔ جہاز بائیں جانب جھکتا محسوس ہوا۔ اس نے سیٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے' بریک پر جسم کا پورا دباؤ ڈالا اور ہاتھ سے لرزتے ہوئے کنٹرول کو سنبھالا۔ نامانوس دباؤ کے تحت جہاز بری طرح لرز رہا تھا اور عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔ جہاز تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا اور وہ بریک پر مزید دباؤ اس خوف سے نہیں ڈال رہا تھا کہ کوئی ٹائر نہ اڑ جائے۔

روشنیاں تیزی سے گزر رہی تھیں اور وہ خوف زدہ تھا۔ آخری دو روشنیاں رہ گئیں تو اسے احساس ہوا کہ جہاز رک رہا ہے۔ اب اس نے بریک پر دونوں پیروں سے دباؤ ڈالا۔ بریک لاک ہوئے۔ سڑک سے ربڑ کے ٹکرانے کی چیختی آواز سنائی دی اور جہاز

رک گیا۔ اس نے جھٹکے سے بریک سے پاؤں ہٹائے۔ جہاز کئی فٹ آگے بڑھا۔ اس نے نوز وہیل کو سڑک سے سلپ ہوتا محسوس کیا پھر جہاز کی نوز نیچے جھک گئی۔

بابر نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی "شاندار لینڈنگ۔ میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا کہ روشنیوں کے اختتام پر سڑک خم کھاتی ہے لیکن تم نے خود دیکھ لیا۔"

کیپٹن نوید اپنی سیٹ پر ساکت وصامت بیٹھا تھا۔ اس کا پورا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ اس نے آنکھوں میں اتر جانے والے پسینے کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ اسے اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنے میں ایک منٹ لگا۔ "مسٹر بابر۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ میں غیر معمولی پائلٹ ہوں۔ ورنہ ہم سب مر چکے ہوتے۔ اب میں جہاز کو بند کر کے روشنی کر رہا ہوں۔ تمہیں بھلا لگے یا برا۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔"

☆------------☆------------☆

روشنی ہوئی تو کمال کو لگا کہ وقتی طور پر وہ اندھا ہو گیا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور انہیں روشنی سے ہم آہنگ کرنے کے لئے بار بار پلکیں جھپکانے لگا۔ جہاز کے اندر کا ماحول اسے غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ جیسے سب کچھ پلاسٹک کا بنا ہو اور موجود لوگ مومی مجسمے ہوں۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ اس نے سوفیہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ تھا اور رنگت سپید پڑ گئی تھی۔ وہ واقعی ساکت بیٹھی کوئی مجسمہ ہی لگ رہی تھی۔ ساتھ والی سیٹ پر رئیس اور مظفر بھی ساکت بیٹھے تھے۔ حد یہ کہ نذیر کا بھی یہی حال تھا۔

اچانک جہاز کے باہر ایک دھماکا ہوا۔ جہاز میں موجود سب لوگ گھبرا گئے پھر عقبی دروازہ کھلا اور آوازوں سے لگا کہ کچھ لوگ اوپر چڑھ رہے ہیں۔ کمال نے اپنی تکلیف کو نظرانداز کر کے سیٹ پر پہلو بدلا اور لٹکے پردے پر نظریں جمادیں۔ ایسے پردے جہاز کو مختلف سیکشنوں میں تقسیم کے لئے تھے۔

پردہ ہٹا اور بابر سے ملتا جلتا ایک شخص اندر آیا۔ وہ عمر میں بابر سے بڑا لگ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک دراز قد اور تنومند شخص تھا۔

مختصر الوجود شخص نے نذیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "اشوک کہاں

ہے؟"

نذیر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "اشوک؟ کون اشوک؟"

پستہ قامت منحنی شخص کے چہرے کا تاثر ایک پل کو بدلا مگر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔ "میں بابر کو پیار سے اشوک کہتا ہوں۔"

نذیر اسے شک آمیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ "وہ کیبن میں ہے۔"

"تم لوگوں نے کمال کردیا۔" منحنی شخص بولا۔ "ایسا کام اس ملک میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جب تم لوگوں نے پولیس والوں کو ختم کیا تو میں سمجھا کہ کھیل ختم ہو رہا ہے.......... لیکن.......... بابر انہیں انگلیوں پر نچاتا رہا۔ واہ بھئی واہ۔ تم لوگ واقعی داد کے مستحق ہو۔"

"یہاں کی صورت حال کیا ہے؟"

"سب کچھ تیار ہے۔ ہم راولپنڈی سے ملتان جانے والی ویگن لائے ہیں۔ روٹ کی گاڑی ہے۔ مسافر بھی پورے ہوں گے۔ کسی کو شک بھی نہیں ہوسکتا۔ تمام انتظامات مکمل ہیں۔"

اس گفتگو نے کمال کو دہلادیا۔ وہ جانتا تھا کہ بابر اسے ختم کرنے کا تہیہ کرچکا ہے لیکن اب ثابت ہو رہا تھا کہ وہ تمام یرغمالیوں کو ختم کرنے کا تہیہ کرچکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ گفتگو ان کے سامنے نہیں کرتے۔

اسی لمحے بابر کیبن سے نکلا۔ اس کے ہونٹوں پر بے حد کشادہ مسکراہٹ تھی۔ وہ منحنی شخص کی طرف بڑھا اور اس سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ "کہو گوپال.......... کیسی رہی؟"

منحنی شخص نے آنکھوں سے نذیر کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے، اب ان سے کیا پردہ۔" بابر نے کہا۔ "یہ ہمارے ساتھی ہیں۔ اب یہ کہیں اور تو نہیں جاسکتے۔"

"پھر بھی.........."

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" بابر نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"تت.......... تو.......... تو تمہارا نام اشوک ہے۔" نذیر بوکھلایا ہوا نظر آرہا تھا۔

"ہاں۔ میں اشوک ہوں اور یہ بملا۔" اشوک نے شہلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم ہندو ہو؟" نذیر کو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

"ہندو ہی نہیں، میں بھارتی ہوں۔ بھارت ماتا کا ادنیٰ سیوک۔"

نذیر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کچھ دیر تو اس سے بولا ہی نہیں گیا پھر اس نے بمشکل پوچھا۔ "اور شہناز؟"

"وہ شہناز ہی ہے۔"

"اور مشکور!"

"وہ بھی مشکور ہی ہے۔"

گوپال نذیر کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اشوک.......... تم نے غلطی کی ہے۔ اب اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔"

"کوئی بات نہیں۔ رائفل اس سے لے لو۔ غیر مسلح کردو اسے۔ زیادہ گڑبڑ کرے تو اس کا شمار بھی یرغمالیوں میں کرلیں گے۔" اشوک نے کہا۔ پھر وہ نذیر کی طرف مڑا۔ "تمہارا کیا خیال ہے۔ پانچ کروڑ میں سے اپنا حصہ لینا چاہتے ہو یا موت۔"

نذیر کو فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس نے وہ سب کچھ دولت ہی کے لئے تو کیا تھا۔ اس نے کہا "اشوک.......... میں تمہارے ساتھ ہوں اور رہوں گا۔"

"دیکھا تم نے۔ میں ٹھوک بجاکر ساتھی بناتا ہوں۔" بابر نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "تمہیں رقم دکھاؤں گا تو حیران رہ جاؤ گے۔"

"یہ بتاؤ، اب ہمیں کارکردگی دکھانے کا موقع کب ملے گا؟" گوپال نے پوچھا۔

"بہت جلد۔ منصوبے میرے پاس کئی ہیں۔ میں نے شہر کا انتخاب بھی کرلیا ہے۔ ہم اس سفر کی گرد بیٹھنے کا انتظار بھی نہیں کریں گے۔ یوں ان کا دھیان ہماری طرف سے ہٹ جائے گا۔"

وہ کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے پھر نذیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے گوپال سے

پوچھا۔ "ہماری ساتھی شہناز کا کیا ہوا؟"

گوپال بے تاثر چہرہ لئے اسے دیکھتا رہا۔ "وہ نہیں آسکے گی۔"

"کیوں؟" نذیر نے پوچھا۔

"پولیس والے اس تک پہنچ گئے تھے۔ اسے گولی لگی تھی پھر خبر آئی کہ وہ اسپتال میں مرگئی۔ شناخت کے لئے اس کی تصویر مسلسل ٹی وی پر دکھائی جارہی ہے۔"

نذیر کو یہ سن کر جھٹکا لگا۔ اس نے سیٹ کی پشت گاہ کو تھام کر خود کو سنبھالا۔ "اس نے زبان کھولی.........؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔ خبروں میں بتایا گیا تھا کہ پولیس آپریشن کے بعد اس سے پوچھ گچھ کرے گی لیکن وہ آپریشن کے دوران ہی مرگئی۔"

نذیر کے اندر کچھ ٹوٹ گیا۔ اس نے نئی زندگی کے خواب شہناز کے ساتھ مل کر دیکھے تھے۔ وہ مشترکہ خواب تھے اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس منصوبے پر عمل درآمد کے دوران اتنی خوں ریزی ہوگی۔ اس نے اکثر سوچا تھا کہ پولیس نے دھاوا بول دیا تو کیا ہوگا۔ مقابلہ ہوگا تو لوگ تو مارے جائیں گے۔ یہ اس کے لئے قابل قبول تھا مگر نازیہ کی موت نے اسے ہلا دیا تھا۔ اس کے لئے وہ غیر ضروری تھی۔ اس کو نہیں مارنا چاہئے تھا اور اب شہناز! وہ بدنصیب دکھی عورت، جو ہمیشہ لٹتی رہی اور آخر میں اس کے خوابوں کے ساتھ اس کی زندگی بھی لٹ گئی۔

پھر اس نے سوچا، اچھا ہی ہوا جو وہ مرگئی۔ اسے پتا چلتا کہ شہلا بہلا ہے اور بابر اشوک تو کیا ہوتا۔ وطن دشمنوں کا آلہ کار بننے کا داغ اس نے تو دولت کی خاطر قبول کرلیا تھا لیکن شہناز شاید یہ برداشت نہ کرپاتی اور آخر کار اشوک کے ہاتھوں ماری جاتی۔ انجام شاید یہی ہونا تھا اس کا۔

اشوک کیبن کی طرف جارہا تھا۔ نذیر نے راستے میں اسے روک لیا۔ "سنو اشوک، ان لوگوں کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "ہم پہلے ہی کافی لوگوں کو ختم کرچکے ہیں۔ ان لوگوں کا قتل ہمارے مستقبل کے منصوبوں کے لئے تباہ کن ہوگا۔ اگر لوگوں کو یقین ہو کہ یرغمالیوں کو ہر حال میں مارے جانا ہے تو ہمارے

مطالبات وہ کیوں تسلیم کریں گے۔"

اشوک استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "میری حقیقت جاننے کے باوجود تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میرا مقصد بھاری زرتاوان وصول کرنا ہے۔ ارے بے وقوف، میں اس ملک میں انار کی پھیلانا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد لوگوں کو عدم تحفظ کا احساس دلانا ہے۔ رقم تو بونس ہے میرے لئے۔"

"اس کے باوجود اگر تم نے یہ تاثر قائم کردیا کہ تم مطالبات پورے ہونے پر بھی یرغمالیوں کی جان بخشی کے قائل نہیں ہو تو اگلا آپریشن ہمارا آخری آپریشن ہوگا۔ وہ ہمیں ختم کردیں گے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو نذیر۔" اشوک نے سرد لہجے میں کہا "دراصل تم کمزور آدمی ہو......... بہت کمزور۔ جہاز کا عملہ اور چاروں یرغمالی......... سب کو مرجانا ہے۔ تم چاہو تو انہیں بچانے کی کوشش کر دیکھو۔ بس ایک لاش کا اور اضافہ ہوجائے گا۔ تمہاری لاش کا۔ کیا یہ تمہارے خیال میں مناسب سودا ہے؟"

نذیر کی نظریں جھک گئیں۔ وہ پہلے دن سے ہی خود کو اشوک کے سامنے بے بس محسوس کرتا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا "میں ایسی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے" اشوک نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "اب تم ایسا کرو کہ یکسپلوزیوز کو لے کر نیچے اترو اور ویگن سے چار سوٹ کیس نکال کر یہاں لے آؤ پھر جا کر یگن اسٹارٹ کرو۔ ہم رقم نئے سوٹ کیسوں میں منتقل کریں گے اور پھر چل دیں گے۔ ں کے بعد تم محفوظ ہوگے۔"

"ٹھیک ہے۔" نذیر نے کہا اور پلٹا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"اور جلدی کرنا۔"

نذیر نے ایکسپلوزیوز اٹھائے اور عقبی حصے کی طرف چل دیا۔ وہ یرغمالیوں سے ریں چرا رہا تھا۔ کمال کی نگاہوں میں اس کے لئے کھلی نفرت تھی۔ اسی لمحے اشوک کیبن ے دروازے پر نمودار ہوا۔ "نذیر......... ویگن کو جہاز کے قریب ہی لے آنا۔ سوٹ س منتقل کرنے میں آسانی رہے گی۔"

نذیر نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور چلتا چلا گیا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ جہاز کے دروازے سے سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ اترنے سے پہلے اس نے ڈائنامیٹ کے دونوں پیکٹوں کو سیڑھی کی سائیڈ میں جہاز کے پاس گرادیا۔ وہ ریڈیو کی مخصوص فریکوئنسی پر سیٹ ہونے کی وجہ سے عام حالات میں بے ضرر تھے۔

ویگن میں آٹھ افراد بیٹھے تھے۔ وہ واقعی مسافر ہی لگ رہے تھے لیکن نذیر جانتا تھا کہ وہ دوسرے اور تیسرے یونٹ کے اراکین ہیں۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ یونٹ دہشت گردی کے یونٹ ہیں۔ "را" کے تربیت یافتہ ایجنٹوں کو تخریب کاری اور دہشت گردی کے لئے بھارت سے پاکستان بھیجا گیا ہے۔

اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ "وہ پورے مسافروں کی ویگن تھی۔ وہ پندرہ سیٹیں تھیں۔ آٹھ افراد ویگن میں موجود تھے۔ دو اوپر جہاز پر تھے اور چار وہ خود تھے۔ مشکور' وہ خود' بملا اور اشوک۔ بملا اور اشوک اب بھی اسے اجنبی اور نامانوس نام لگ رہے تھے۔

☆------------☆------------☆

چمکیلی روشنیوں میں جہاز کا ماحول مصنوعی اور سرد معلوم ہو رہا تھا۔ کمال کا عجیب حال تھا۔ لینڈنگ نے اس کے نڈھال جسم کے ساتھ اور ظلم کیا تھا۔ انجر پنجر ڈھیلے ہوگئے تھے۔ اب وہ آہستگی سے سنبھل رہا تھا لیکن اس انکشاف نے کہ یہ کارروائی درحقیقت را کے ایجنٹوں کی ہے' جس میں انہوں نے پاکستانیوں کو بھی استعمال کیا ہے' اس کے بدن میں بجلیاں سی بھر دی تھیں۔ اس سے پہلے اس خیال نے کہ اس کے ہم وطن بھی ایسے سفاک ہوسکتے ہیں' اس کے مورال کو تباہ کردیا تھا مگر اس کے اندر ایک نیا عزم' نیا حوصلہ جاگ رہا تھا۔ وہ دہشت گردوں کو دیکھتا رہا' جو پُرسکون انداز میں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ یوں وہ لینڈنگ کے نتیجے میں منتشر ہونے والے اعصاب کو تھپک رہے تھے۔

کمال کو معلوم ہوگیا تھا کہ جہاز پر موجود دہشت گردوں میں دو ہندوؤں کا اضافہ ہوگیا ہے۔ نیچے شاید اور بھی کئی ایک موجود ہوں' لیکن اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ کسی طرح مظفر یا رئیس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ اس

بات کا دہشت گردوں میں سے کسی کو احساس نہ ہو۔ چنانچہ وہ کسی مناسب موقعے کا منتظر تھا۔ ان لوگوں کو روکنے کی کوئی کوشش اگر کرنی تھی تو اس کے لئے ضروری تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار ہو اور چاقو کے سوا کچھ میسر نہیں تھا' جو رئیس کے پاس تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ نذیر نیچے جاچکا تھا۔ اشوک دوسرے دو دہشت گردوں کے ساتھ جہاز کے عقبی حصے میں تھا' جہاں زرتاوان کے سوٹ کیس رکھے تھے۔ مشکور کیبن میں تھا اور یہاں صرف بملا تھی۔ (کمال کو حیرت ہونے لگی کہ اس نے دہشت گردوں کے اصل ناموں کو کتنی آسانی سے قبول کرلیا تھا۔)

یہ مناسب موقع تھا۔ جیسے ہی مظفر نے اس کی طرف رخ کیا' اس نے مظفر کو اشارے سے بتایا کہ وہ رئیس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ مظفر نے رئیس کو بتایا اور رئیس اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اب وہ زبان سے بول نہیں سکتا تھا۔ سو وہ اشاروں میں رئیس کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ اسے چاقو کی ضرورت ہے۔ یہ مرحلہ خاصا دشوار تھا۔ بالآخر وہ اپنی بات سمجھانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ رئیس اور مظفر درمیانی راستے کے دوسری طرف اس سے دو قطار آگے بیٹھے تھے۔ اگلا مرحلہ اور دشوار تھا۔ چاقو اِدھر سے اُدھر کیسے کیا جائے۔

ابھی کمال کوئی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ رئیس نے بڑی سادگی سے مسئلہ حل کردیا وہ اٹھا اور پیچھے کی طرف چل دیا۔ کمال کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے چاقو کمال کی گود میں گرادیا۔ کمال نے تیزی سے اسے اپنے ہاتھ میں چھپالیا۔

بملا کا ردعمل بہت تیز تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور رائفل کا رخ رئیس کی طرف کئے اس کی طرف بڑھی۔ "کیا بات ہے؟ مرنا چاہتے ہو؟" وہ غرائی۔

"نہیں۔ ہاتھ پاؤں کھول رہا ہوں۔ بالکل اکڑ کر رہ گئے ہیں۔" رئیس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چلو اپنی جگہ بیٹھ جاؤ۔ تمہارے ہاتھ پیروں کو اب کھلنے کی ضرورت نہیں۔"

رئیس اپنی سیٹ پر جابیٹھا۔ بملا کمال کو شک آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی لیکن چاقو اسے نظر نہیں آیا تھا۔

کمال نے اپنی سیٹ سے ٹیک لگائی اور پاؤں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا ہاتھ اندر ہی اندر چاقو کھول رہا تھا۔ اب وہ ایک خاص آواز کا منتظر تھا۔ بلا کے پلٹنے کی آواز کا۔ جیسے ہی اسے وہ آواز آئی۔ اس نے چاقو نکالا اور اٹھ کر اس کی طرف جھپٹا۔ بلا کی پشت اس کے سامنے تھی۔ چاقو کے بلیڈ کو بلا کے گردے میں دھنس جانا تھا لیکن عین موقع پر ایک رائفل کی نال نے مداخلت کی۔ نال اس کی کلائی سے ٹکرائی۔ چاقو ہاتھ سے چھوٹ کر اڑا اور چند قطار دور کسی سیٹ کے نیچے جاگرا۔ خود کمال سیٹوں کے درمیان والی جگہ میں گر گیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا تھا۔

وہ کوشش کرکے اٹھا۔ تب اس نے دیکھا کہ کام بگاڑنے والا کون تھا۔

اشوک کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔ ”کمال رشید.......... بس اتنا ہی کرسکتے ہو تم۔ اتنی ہی سوچ ہے تمہاری۔ اس طرح تم چھ مسلح افراد کو کیسے روک سکتے ہو۔ مجھے مایوسی ہوئی ہے۔“

کمال اپنی سیٹ پر ڈھیر ہوگیا۔ جسم میں پھر ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں مایوس کیا۔“

”سب سے بڑی بات یہ کہ تم ایک کمزور لڑکی پر پیچھے سے وار کررہے تھے۔ مجھے تم سے کسی ہیرو کے سے طرز عمل کی توقع تھی۔“

”کمزور لڑکی۔“ کمال نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”دہشت گرد کی کوئی جنس نہیں ہوتی۔ را کی تربیت یافتہ لڑکی کمزور کہلائے گی؟؟“

”خیر تم نے مجھے مایوس بھی نہیں کیا۔ اتنی نامساعد صورت حال میں تمہاری یہ کوشش ثابت کرتی ہے کہ تم مرنا نہیں چاہتے۔ اب تمہیں مارنے میں لطف آئے گا۔“

بدلے ہوئے لہجے کو محسوس کرکے کمال نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جو کچھ وہاں دکھائی دیا‘ اس نے اس کے جسم میں سرد لہر دوڑا دی۔ اشوک کا چہرہ سخت نقاب کی صورت اختیار کرگیا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ یہ وہی تاثر تھا جو اس وقت اس کے چہرے پر نظر آیا تھا‘ جب اس نے پچھلی بار اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

رائفل کی نال کمال کی ٹھوڑی کے نیچے نرم عضلات میں دھنس رہی تھی۔ اشوک نے اور دباؤ ڈالا۔ کمال کا سر پیچھے کی طرف گیا۔

”اب.......... اب میں تمہیں قتل کررہا ہوں۔“ اشوک نے پھنکار کر کہا۔

کمال نے اپنے حلق پر موجود دباؤ کم کرنے کے لئے سر کو اور پیچھے ہٹایا لیکن رائفل بھی ساتھ ساتھ آئی تھی۔ اس کوشش کے نتیجے میں اس کے زخمی کندھے اور بازو میں اذیت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے رائفل ہٹانے کی غرض سے اپنا سیدھا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ رائفل کی نال کے وار نے سن کردیا ہے وہ اسے اٹھا نہیں سکا۔ اس نے صوفیہ کو دیکھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ یقینی طور پر شاک کی حالت میں تھی۔

کمال نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور پُرسکون ہوگیا۔ اب زندگی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اسے خوشی تھی کہ اسے آخری لمحوں میں کلمہ پڑھنے کا اللہ کو یاد کرنے کا اور توبہ کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ صرف اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔

ایک لمحے کو اس نے تصور کیا کہ گولی چلی ہے اور وہ مرگیا ہے لیکن درحقیقت کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ چند لمحے کے بعد اسے اشوک کی ہسٹریائی ہنسی سنائی دی پھر اس نے کہا۔ ”کمال رشید! ابھی تم پوری طرح نہیں پکے ہو اور مجھے کچا پھل توڑنا اچھا نہیں لگتا۔ ابھی میں تمہیں کچھ وقت اور دوں گا۔ تم پک جاؤ گے بالآخر۔“ رائفل جھٹکے سے ہٹائی گئی۔ کمال کی ٹھوڑی سینے سے جالگی پھر قہقہے کی آواز دور جانے لگی۔

کمال نے آنکھیں کھول دیں۔ ”اسے مجھے ماردینا چاہئے تھا۔“ وہ بڑبڑایا۔ انداز خود کلامی کا تھا۔ ”اب یہ پچھتائے گا کہ اس نے یہ موقع کیوں ضائع کیا۔“ ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ جو کچھ ہوچکا ہے‘ اس کی روشنی میں اس کی یہ دھمکیاں بے معنی ہیں۔ خالی خولی۔ ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس نے جو کوشش کی تھی‘ وہ بھی بے معنی ہی تھی۔ اشوک نے درست کہا تھا کہ اس طرح وہ چھ مسلح دہشت گردوں پر قابو نہیں پاسکتا۔ واقعی.......... اگر وہ بلا پر وار کر بھی دیتا تو کیا ہوتا۔ اس نے آگے کے بارے میں تو کچھ

نہیں سوچا تھا۔ اس کے پاس آئندہ کے لئے بھی کوئی مکمل لائحہ عمل ہونا چاہئے تھے۔

اس نے سر گھمایا اور سیٹوں کے درمیانی راستے میں کھڑی بملا کو گھورنے لگا۔ اس نے سوچا کہ فیصلہ میرا غلط بہرحال نہیں تھا۔ دہشت گردی کی زنجیر کی سب سے کمزور کڑی بملا ہی تھی اور اس کے پاس دو چیزیں تھیں' جو طاقت کا توازن تقریباً برابر کر سکتی تھیں۔ اس کی رائفل اور بیلٹ سے لٹکتے ہوئے دستی بم۔ وہ اپنے داہنے ہاتھ کو ہلانے لگا تاکہ وہ کارآمد ہو جائے۔ اس نے سوچا' اگر یہ چیزیں مجھے میسر ہوں تو.......... یہ سوچ کر وہ مسکرایا۔ واقعی.......... اشوک نے مجھے زندہ چھوڑ کر جو غلطی کی ہے' وہ مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔

ذرا دیر بعد اشوک واپس آیا۔ وہ بہت اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے چیخ کر مشکور کو حکم دیا کہ وہ عملے سے چھٹکارا پالے پھر وہ گوپال اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جہاز کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ وہ انہیں دولت دکھاتے ہوئے اسے دوسرے سوٹ کیسوں میں منتقل کرنا چاہتا تھا۔

اب وہاں صرف بملا تھی۔ رائفل لئے وہ بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ لگتا تھا' نروس ہے۔ کمال نے سوچا' یہ اس کے لئے قطعی طور پر آخری موقع ہے۔ اب اسے کچھ کرنا تھا۔ یہ اس کا فرض تھا۔ اسے ادا کر دیتا تو وہ سرخروئی سے مر سکتا تھا۔ اب اسے غم نہیں تھا کہ وہ خون بہانے کا اپنا عہد توڑ رہا ہے۔ اب وہ پھر سے پاک فوج کا جوان تھا اور یہ میدان جنگ تھا۔ ہمیشہ کی طرح دشمن کو عددی برتری بھی حاصل تھی اور وہ بہترین اسلحے سے لیس بھی تھا۔

اسی وقت کیبن کی طرف سے ایسی آواز سنائی دی' جیسے ہاتھا پائی ہو رہی ہے پھر کیپٹن نوید کی گونج دار آواز سنائی دی۔ "کیا مطلب؟ کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

چند لمحے توقف رہا پھر مشکور نے جواب دیا۔ "باس نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم لوگوں کو ختم کر دوں۔"

شہلا مضطربانہ انداز میں انچ انچ کر کے کیبن کی طرف بڑھنے لگی پھر وہ رک گئی۔ عین کمال کی سیٹ کے پاس!

پھر اچانک ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ جہاز میں ہونے والی ہر سرگرمی رک گئی۔ جہاز میں موجود تمام لوگوں نے خود کو اوپر اٹھتا محسوس کیا۔ جہاز اپنے بائیں ونگ پر اٹھنے لگا تھا۔ پھر دائیں جانب جھکنے لگا۔ اس کے بعد اس کے پہیے نکلے اور وہ پیٹ کے بل بیٹھتا چلا گیا۔ دھماکا ہوتے ہی جہاز میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ بس کھڑکیوں کے باہر نارنجی رنگ کی بہت چمک دار روشنی ہو رہی تھی' جس سے جہاز میں بھی اندھیرا نہیں رہا تھا۔ کمال نے خود کو اوپر اٹھتے اور پھر جھٹکے سے نیچے گرتا محسوس کیا۔ گونج دار آواز جتنی تیزی سے ابھری تھی' اتنی ہی تیزی سے معدوم ہو گئی۔ جہاز میں بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ خاص طور پر عقبی حصے میں۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔

پھر ایک اور دھماکا ہوا اور آواز سے اندازہ ہوا کہ آگ بھڑکی ہے۔ شاید کوئی فیول کی ٹینکی پھٹی تھی..........!

☆=============☆=============☆

نذیر نے ویگن اسٹارٹ کی اور اسے جہاز کے پاس سیڑھیوں کے برابر لا کر کھڑا کر دیا۔ ویگن میں نسبتاً چھوٹے آٹھ سوٹ کیس تھے۔ عام سوٹ کیس جیسے مسافروں کے پاس ہوتے ہیں۔ اس نے وہ سوٹ کیس گوپال اور اس کے ساتھی کو دیئے کہ جہاز پر پہنچا دیں۔

وہ پھر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ وہ پریشان تھا۔ جہاز سے اب کسی بھی لمحے فائرنگ کی آوازیں آ سکتی تھیں۔ وہ اشوک کا شکر گزار تھا کہ اس نے اسے نیچے بھیج دیا۔ اب اسے وہ قتل عام دیکھنا نہیں پڑے گا۔ دیکھنا تو کجا' وہ فائرنگ کی آواز بھی نہیں سننا چاہتا تھا۔ کاش وہ کسی طرح اس قتل عام کو روک سکتا لیکن وہ جان دے کر بھی نہیں روک سکتا تھا۔

اس نے ویگن میں نصب ریڈیو آن کر دیا۔ فضا میں ہلکی سی کھرکھراہٹ ابھری۔ وہ کسی اسٹیشن کی تلاش میں ٹیونر گھمانے لگا۔ ڈائل کی طرف دیکھ کر سوئی آگے لے جاتے ہوئے اس کے ذہن میں کوئی بھولی بسری یاد چٹخنے لگی۔ اس نے سرخ سوئی کو دو نمبروں کے درمیان ٹھہرایا۔ ہلکی سی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ سوچتا رہا کہ ذہن میں یہ خلش کیسی ہے۔

اس نے سوئی کو معمولی سا ادھر ادھر گھمایا تاکہ اسٹیشن صاف لگ جائے۔ آواز قدرے صاف ہوئی۔ چند الفاظ سنائی دیئے لیکن کھرکھراہٹ اب بھی ہو رہی تھی۔

اچانک وہ اپنی جگہ ٹھٹھر کر رہ گیا۔ وہ اہم بات اسے یاد آ گئی تھی۔ اس نے ریڈیو کے روشن ڈائل کو جھک کر دیکھا۔ اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہوگئی۔ اس نے سوئی کو اس خاص فریکوئنسی پر ٹھہرا دیا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیونر کو گھمانے کی کوشش کی لیکن بہت دیر ہوچکی تھی۔ ڈائنامیٹ کے پیک خوف ناک دھماکے سے پھٹ گئے۔

☆============☆============☆

کمال نے سانس تک روک لی تھی۔ وہ دم سادھے بیٹھا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر کچھ ہوگیا ہے پھر اچانک اسے خیال آیا کہ جہاز کسی بھی لمحے پھٹ سکتا ہے۔ اس کے رگ وپے میں خوف دوڑ گیا۔ وہ اندھیرے میں دم سادھے ایک اور دھماکے کا منتظر تھا کہ اچانک روشنی واپس آگئی۔

جہاز کے اندر کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ سوائے اس کے کہ بملا درمیانی راستے پر گر پڑی تھی اور اب اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیبن کی طرف سے مشکور کے ہکلانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عقبی حصے میں اشوک جانے کس پر برس رہا تھا۔ "اب یہ سوٹ کیس تو دور اچھال دو۔ جہاز کی ٹینکی پھٹ گئی تو سب تباہ ہوجائے گا۔"

کمال کو پھر متلی کا احساس ستانے لگا۔ اس کے نتیجے میں جسم میں کمزوری کی لہر سی دوڑ گئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا وجود پگھل رہا ہے۔ ہاتھوں اور ٹانگوں میں جیسے جان نہیں رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی نرم گرم بستر میسر ہو اور وہ سوجائے۔ اسے سکون کی ضرورت تھی۔

وہ کمزوری کے ہر احساس سے لڑ رہا تھا۔ ذہن سے باہر دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ کمزوری کو قبول کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ خود کو یاد دلاتا رہا کہ اس پر کئی اعتبار سے ایک فرض عائد ہوتا ہے اور اسے وہ ادا کرنا ہے۔ بالآخر اس کے اندر ایک نامعلوم توانائی

اور مضبوطی امنڈنے لگی۔

کیبن کی طرف سے کیپٹن کی آواز سنائی دی۔ "اب تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری طرف سے کسی کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔"

کمال کے ذہن سے دھند چھٹنے لگی۔ اسے یاد آگیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ بملا اٹھ چکی تھی اور اب لڑکھڑاتے قدموں سے کیبن کی طرف جانے کے ارادے سے بڑھ رہی تھی۔ ایسی پھرتی سے جو خود اس کے لئے بھی حیران کن تھی، کمال نے اپنے زخمی بازو کو سیٹ پر لپٹا کر گرفت بناتے ہوئے خود کو سیٹ سے اٹھایا اور بملا کی رائفل تھام لی۔ بائیں کندھے اور بازو پر گزرنے والی قیامت کا اسے احساس بھی نہیں تھا۔

بملا اور کمال ایک لمحے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ بملا کی آنکھوں میں چیلنج تھا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ تم ایسا نہیں کرسکتے۔ تم عورت پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ عورت کا خون نہیں بہا سکتے۔

کمال بھی اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اب صورت حال بدل چکی ہے۔ اخلاقی تقاضے بدل چکے ہیں۔ شہلا نامی عورت کی بات اور تھی اور بملا نامی بھارتی دہشت گرد کی بات اور ہے۔ ویسے بھی اب تک جو کچھ ہو چکا تھا، اس کے بعد اس کے دل میں رحم کا شائبہ بھی موجود نہیں تھا۔ اب اور ستم کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ وہ دہشت گردوں سے ان کے انداز میں نمٹنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

اس نے زور لگاتے ہوئے جھٹکا دیا۔ بملا لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے ہٹی۔ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ گر گئی۔ رائفل اب کمال کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے رائفل سنبھالتے ہوئے اپنا پاؤں بملا کے پیٹ پر رکھ دیا کہ وہ اٹھ نہ سکے۔ بملا کے چہرے پر خوف تھا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے اپنی بیلٹ کی طرف لپکا، جہاں دستی بم لٹکے ہوئے تھے۔ بملا کی اس غلطی نے کمال کو فیصلے پر پہنچنے میں مدد فراہم کی۔ کمال نے اس وقت جو شدید نفرت محسوس کی، وہ خود اس کے لئے بھی حیران کن تھی۔ اس نے رائفل کی نال بملا کے حلق پر لگائی اور ٹریگر دبا دیا۔ یہ احساس اسے بعد میں ہوا کہ اس نے کیا کیا ہے۔ وہ جبلی ردعمل تھا۔

بلا کی آنکھیں پھیلیں۔ اس نے رائفل کی نال کو دونوں ہاتھوں سے دبوچا۔ کمال نے دوبارہ ٹریگر دبادیا۔ بلا کے حلق سے خون کا فوارہ ابلا۔ کمال کی پینٹ کے پائنچے خون میں تر ہوگئے۔ خون جہاز کے فرش پر بھی بہہ رہا تھا۔ بلا کی گردن تقریباً جسم سے علیحدہ ہوگئی تھی۔

کمال سحر زدہ سا کھڑا بہتے ہوئے خون کو دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن پر دھند سی چھانے لگی پھر بلا کے جسم نے ایک جھٹکا لیا تو وہ چونکا۔ اسے خیال آیا کہ ابھی اس کا کام پورا نہیں ہوا ہے۔

جہاز کے عقبی حصے سے اشوک کی آواز سنائی دی۔ ”اب ہم ہر طرح سے پھنس چکے ہیں۔ ویگن بری طرح تباہ ہوگئی ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”پاگل ہوگئے ہو۔“ گوپال بولا۔ ”ویگن کا حشر دیکھ رہے ہو۔ اس میں تو کوئی بھی نہیں بچا ہوگا۔“

کمال نے فرش پر بہتے خون سے نظریں اٹھائیں۔ کیبن کے دروازے میں کیپٹن نوید ہاتھ میں شاٹ گن لئے کھڑا تھا۔

ادھر عقبی حصے میں اشوک کہہ رہا تھا۔ ”اندر چلو۔ مجھے کچھ خون ریزی کرنی ہے۔ ادھر سے نمٹ کر پھر کچھ سوچیں گے۔“

کمال نے رائفل بائیں ہاتھ میں تھامتے ہوئے جھک کر بلا کی بیلٹ سے ایک بم نوچ لیا۔ بائیں بازو اور کندھے میں ہونے والی تکلیف کی اب اسے کوئی پرواہ نہیں تھی پھر وہ پلٹ کر چلایا۔ ”اپنی سیٹوں میں دبک جاؤ اور دونوں ہاتھوں سے کان بند کرلو۔ جھک جاؤ..........“

خود جھک کر رائفل کو بائیں پہلو سے لپٹاتے ہوئے اس نے بم کی پن کھینچی اور اسے پردے کی طرف اچھال دیا‘ جسے اسی لمحے ایک طرف ہٹایا گیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے خالی سیٹوں کے درمیان چھلانگ لگادی۔ دھماکے نے جہاز کو ہلا ڈالا۔ دھات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے سر کے اوپر سے اڑتے ہوئے گئے۔

اس کی طبیعت پھر بگڑنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہیں پڑا رہے اور کچھ دیر آرام

کرلے لیکن اسے یاد تھا کہ اسے کام مکمل کرنا ہے وہ کوشش کر کے سیٹوں کے درمیان سے نکلا اور پردے کی طرف جھپٹا۔ اس نے پردے پوری طرح ہٹائے۔ وہاں زہریلا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ اسے پھندا لگ گیا اور اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ وہ کسی نرم چیز سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑایا۔ وہ لاش تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ وہ گوپال تھا۔ اس نے چیک کیا وہ واقعی مرچکا ہے پھر وہ لپکتے قدموں سے آگے بڑھا۔ وہ تمام سیٹوں کو چیک کررہا تھا۔ جہاز کے بالکل عقبی حصے میں دروازے کے قریب اسے دو سیٹوں کے درمیان گوپال کا دوسرا ساتھی نظر آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیٹ پر تھے۔ وہ کھانسنے کے دوران کراہ رہا تھا۔

کمال نے ایک ہاتھ کی مدد سے رائفل بلند کی اور اس کے سینے کے درمیان گولی ماری۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف جاگرا۔

اب اسے اشوک کی تلاش تھی لیکن اشوک جہاز میں موجود نہیں تھا۔ یعنی وہ جہاز سے نکل چکا تھا۔

کمال دروازے کی طرف لپکا جو سیڑھی دروازے سے لگائی تھی اس کے چیتھڑے اڑ چکے تھے۔ اب چھلانگ لگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اور اس کی جسمانی حالت ایسی نہیں تھی لیکن اس پر جنون طاری ہورہا تھا۔ اس نے احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں اشوک چھپا ہوا نہ ہو۔ مطمئن ہو کر اس نے پہلے رائفل پھینکی اور پھر خود چھلانگ لگادی۔ اس نے چھلانگ لگاتے ہوئے یہ خیال رکھا تھا کہ وہ دائیں ہاتھ کے بل گرے۔ اس کے باوجود اس کے جسم کے بائیں حصے میں اذیت کی لہر دوڑ گئی۔

چند لمحے وہ یونہی ساکت پڑا رہا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اٹھ سکے گا۔ رائفل اس سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر پڑی تھی لیکن اسے اٹھانا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس کی نظر تباہ شدہ ویگن پر پڑی پھر جا بجا بکھرے ہوئے انسانی اعضا نظر آئے لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ سب کیسے ہوا ہوگا۔

بالآخر قوت ارادی اور کام مکمل کرنے کی ضرورت کے احساس نے اسے تقویت دی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے رائفل اٹھائی اور جہاز کے عقب کی طرف بڑھنے لگا۔

اچانک اسے اشوک بھاگتا نظر آیا۔ اس نے رائفل سیدھی کی لیکن فوراً جھکالی۔ فاصلہ زیادہ تھا۔

وہ بھی اسی طرف بھاگنے لگا۔ اشوک نے بھاگتے بھاگتے پلٹ کر اسے دیکھا اور اپنی رفتار بڑھادی۔ کمال کو یقین نہیں تھا کہ وہ اشوک تک پہنچ سکے گا لیکن جب تک ٹانگوں میں جان تھی' وہ اس تعاقب سے دستبردار نہیں ہوسکتا تھا۔ اشوک کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔

☆-------------☆-------------☆

اشوک نے پلٹ کر دیکھا تو بس ایک ہیولا نظر آیا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ کیپٹن نوید ہوگا۔ صرف وہی' اس کے منصوبوں کا بیڑہ غرق کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ وہ کچھ زیادہ ہی ریلیکس کرگیا تھا۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا تھا اس نے۔ اسے پہلی فرصت میں یرغمالیوں کو بھی ختم کردینا چاہئے تھا اور جہاز کے کریو کو بھی۔

اور اب وہ خوف زدہ بھی تھا۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ اب اسے جان بچانے کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی۔ یہ اس کے لئے نئی بات تھی۔ اب تک وہ ایسی کسی صورت حال سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ مقابلہ کرنے کے لئے وہ دوسروں کو استعمال کرنے کا عادی تھا۔ اب تک اس کا واسطہ نہتے لوگوں سے پڑا تھا۔ کمزور لوگوں سے یا ایسے لوگوں سے' جنہیں اس نے بے خبری میں مارلیا تھا۔ اب تک اسے زندہ رہنے کے لئے جدوجہد نہیں کرنی پڑی تھی۔ سو اب وہ متوحش تھا۔

اچانک وہ کسی چیز سے ٹکرا کر گرا۔ وہ سڑک کوٹنے والا انجن تھا۔ یہ وہ مقام تھا' جہاں سڑک کی تعمیر کرنے والے آلات اور سڑک کی تعمیر میں استعمال ہونے والے سامان کا ذخیرہ کردیا گیا تھا۔ یہ اچھی جگہ ہے۔ اس نے اٹھتے ہوئے سوچا۔ اچھا خاصا قلعہ ہے یہ۔ یہاں سے وہ کیپٹن کو نشانہ بنا سکے گا۔

وہ بہت بے تکا گرا تھا۔ بھاری چیز اب بھی اس کی ٹانگ پر گری ہوئی تھی اور ٹانگ کو وہ ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔ تکلیف کے باوجود اس نے خود کو اٹھاتے ہوئے بھاری چیز

کو ہاتھ سے دھکیل کر گرانے کی کوشش کی لیکن وہ اسے نہ ہلا سکا۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ سیمنٹ کی بوری ہے۔

وہ سڑک کوٹنے والے انجن کی اوٹ میں تھا۔ انجن کے پیچھے وہ بوریوں کی دیوار سی تھی' جس سے وہ ٹکرایا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ گرنے والی پہلی بوری نے اس کی گردن نہیں توڑ ڈالی لیکن اب بھی وہ اچھے حال میں تو نہیں تھا۔

اس نے انجن کے نچلے حصے سے باہر دیکھا۔ اس کے تعاقب میں آنے والا اب کافی قریب آگیا تھا۔

☆-------------☆-------------☆

کمال نے اشوک کو رولر انجن سے ٹکرا کر گرتے دیکھا پھر وہ اٹھا اور آگے بڑھا۔ کمال کو انجن کے عقب میں بوریوں کی دیوار سی نظر آئی۔ درحقیقت وہ بوریوں کا کمرا سا تھا۔ اشوک اندھا دھند اس طرف گیا تھا پھر اگلے ہی لمحے اسے دھماکا سنائی دیا تھا۔

کمال نہیں سمجھ سکا کہ کیا ہوا ہے لیکن اسے یقین ہوگیا کہ اشوک اب اس کے ہاتھ سے نہیں بچ سکے گا۔ وہ زیادہ دیر تو وہاں محصور نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے طمانیت سے سوچا کہ اب تمام حساب چکانے کا وقت آگیا ہے۔ ہر وہ تکلیف جو اس دہشت گرد نے اسے پہنچائی تھی' ہر وہ انسانی جان جو اس نے لی تھی.......... ہر چیز کا حساب لینا ہے اس سے۔ اگر اشوک سیدھا بھاگتا جاتا تو اس کے لئے کوئی امکان نہ رہتا اس تک پہنچنے کا لیکن اب وہ پھنس چکا تھا۔

وہ بھاگتے بھاگتے رک گیا۔ اب وہ پُراعتماد قدموں سے رولر انجن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ انجن سے دس فٹ دور رہا ہوگا کہ فائر ہوا۔ گولی اس کی بائیں ران میں پیوست ہوئی تھی۔ وہ گرا۔ گرتے ہی اسے رولر انجن کے عقب میں گرا ہوا اشوک نظر آیا۔ وہ بے بسی کے عالم میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگ پر سیمنٹ کی بوری گری ہوئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے.......... اذیت اٹھا کر فائر کرنے کے لئے پوزیشن بنائی ہوگی۔

کمال کی ذہنی کیفیت اب ایسی تھی کہ وہ تکلیف کے ہر احساس سے ماورا ہوچکا

تھا۔

☆-----------☆-----------☆

اشوک یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ آنے والا کون ہے۔ اسے اس کی ٹانگیں تو نظر آرہی تھیں لیکن بالائی جسم اور چہرہ رولر انجن کے عقب میں تھا۔ اس نے اپنی پوزیشن بناتے ہوئے رائفل کو سیمنٹ کی اسی بوری پر ٹکایا' جو اس کی ٹانگ پر پڑی ہوئی تھی۔ درد اب اس کی برداشت سے باہر ہوا جارہا تھا۔

اس شخص پر فائر کرنے میں اسے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہورہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جہاز کے عقبی حصے میں موجود اس کے دو ساتھی بم پھٹنے کے نتیجے میں اگر ہلاک نہیں بھی ہوئے تھے تو شدید زخمی ضرور ہوئے ہوں گے۔ ان کے جہاز سے باہر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مشکور جہاز کے کیبن میں تھا اور وہ حکم کا بندہ بغیر ہدایت کے کچھ کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اب یہی امکان رہ گیا تھا کہ آنے والا جہاز کے کریو میں سے کوئی ہے۔

اس نے بڑی احتیاط سے نشانہ لیا اور فائر کردیا۔

گولی آنے والے کی ران میں لگی۔ ٹانگ ایک جھٹکے سے ہٹی۔ پھر وہ شخص اچھل کر گرا..........

اشوک کو اپنے دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہوئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کے سامنے کمال رشید تھا۔

اس سے پہلے کہ اشوک حیرت سے سنبھلتا' کمال اچھل کر سامنے سے ہٹ گیا۔ اشوک کی چلائی ہوئی چھ گولیاں عین اس جگہ لگیں جہاں چند لمحے پہلے کمال گرا ہوا تھا۔ ادھر ٹانگ کی تکلیف بڑھ رہی تھی۔ وہ اس پوزیشن میں رہ کر زیادہ دیر مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے سیمنٹ کی بوری کو ہٹا کر پھنسی ہوئی ٹانگ کو نکالنے کی کوشش کی۔ ٹانگ کا حال خواہ کچھ بھی ہو' لیکن اب وہ اس قید سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ یوں تو کمال اسے باآسانی ختم کردیتا۔

اس نے پورا زور لگایا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی لیکن وہ بوری کو نہ ہٹا سکا۔ البتہ بوری ذرا سی سرکی تھی اور اس کی ٹانگ پر قیامت گزر گئی تھی۔

داہنی سمت سے اسے آہٹ محسوس ہوئی۔

کمال زمین پر گرا ہوا سینے کے بل آگے بڑھ رہا تھا۔ اشوک نے رائفل تھامتے ہوئے اپنے جسم کو داہنی جانب موڑنے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ کمال کی رائفل کی نالی' اس کی گردن سے بمشکل چھ انچ دور تھی۔

"کمال رشید.......... تم مجھے زندہ بھی گرفتار کرسکتے ہو۔" اس نے التجا کی۔

"تمہیں گرفتار کرنا میرا کام نہیں۔" کمال نے سرد لہجے میں کہا "تم میرا ذاتی معاملہ ہو۔"

"میں را کا ایجنٹ ہوں۔ بہت قیمتی معلومات فراہم کرسکتا ہوں۔"

کمال نے چند لمحے سوچا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔ اب وہ سانپ کی گردن پر ہاتھ ڈال چکا تھا۔ ایک لمحے کی کوتاہی بھی ہوتی تو وہ خود ڈسا جاتا۔ اس کی اپنی حالت اچھی نہیں تھی۔ ران سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ صرف قوتِ ارادی کے زور پر کوئی کتنا چل سکتا ہے۔ "مجھے اس سے کوئی غرض نہیں اشوک۔ تم میرا نہیں' اور لوگوں کا درد سر تھے۔ وہ تمہیں دور نہ کرسکے تو وہ جانیں۔ تم پاکستان میں داخل ہوئے۔ تم نے اتنی بڑی کارروائی کی۔ یہ ہماری وزارت داخلہ کی اور ہماری سیکیورٹی ایجنسیوں کی نااہلی ہے۔ میں تو وہی کچھ کروں گا جو کرسکتا ہوں۔"

"پلیز' میری بات سنو۔" اشوک گڑگڑایا۔

"سوری۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"سنو کمال.........." اشوک ہذیانی انداز میں چلایا۔

"جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں اسی طرح ختم کروں' جس طرح تم مجھے ختم کرنا چاہتے تھے لیکن' میں نہ بے رحم ہوں اور نہ دہشت گرد۔ ناؤ گو ٹو ہیل.........." کمال نے ٹریگر دبادیا۔ اس کے بعد چند منٹ اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔

آنکھ کھلی تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اب جسم کسی مشقت کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ چلو چھوڑو۔ اس نے خود سے کہا۔ اب تمہیں کون سا کوئی اہم کام کرنا ہے۔ اب تو آرام کرلو کچھ دیر۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

جانے کتنی دیر بعد اسے آتے ہوئے قدموں کی آہٹیں سنائیں دیں لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں پھر کسی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ "کیسے ہو کمال؟" وہ صوفیہ کی آواز تھی۔

اس نے بولنے کی کوشش کی۔ اس کے ہونٹ ہلے لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔

"سر۔ آپ تو سچ مچ ہیرو ہیں.......... مرد میدان۔" وہ رئیس کی آواز تھی۔ "اب میں آپ سے سب کچھ سیکھوں گا سر۔"

وہ مسکرادیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں تک پہنچی یا نہیں۔ بس اس کے بعد اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اسے یقین تھا کہ اب اس کی آنکھ روشنیوں میں کھلے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆ ختم شد ☆☆☆☆☆☆☆